پیشوائے صادقؑ

اللہ

آیت اللہ سید علی خامنہ ای

پیشوائے صادق علیہ السلام

آیت اللہ سید علی خامنہ ای

ترجمہ

سید سعید حیدر زیدی

پیشکش:

سید جاوید رضا نقوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب	:	پیشوائے صادقؑ
مؤلف	:	آیت اللہ سید علی خامنہ ای
ترجمہ	:	سید سعید حیدر زیدی
بشکریہ	:	دار الثقلین، کراچی۔
پیشکش	:	سید جاوید رضا نقوی
تاریخ اشاعت	:	ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ ستمبر ۲۰۱۴ء
طبع دوم	:	جمادی الثانی ۱۴۴۱ھ فروری ۲۰۲۰ء
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
سرورق ڈیزائننگ	:	سید امتیاز عباس
پرنٹنگ	:	العصر پبلشرز، کراچی۔
		فون: 021-36821067

فہرست

❀❀❀❀

عرضِ ناشر

خداوند متعال سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۳۰ میں ارشاد فرماتا ہے: إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (کہ میں زمین پر ایک خلیفہ (جانشین) بنانے والا ہوں) آسمانوں اور زمین کی نعمات کو خلق کرنے کے بعد اللہ نے انسان کو خلق فرمایا تاکہ اسے منصب خلافت تک پہنچائے' عالم خلقت کے فلسفے میں انسان ایک بلند مقام کا حامل ہے یعنی اشرف المخلوقات قرار پایا۔

حضرت علیؑ اس بحث میں فرماتے ہیں: "جب فرشتوں نے اعتراض کیا کہ یہ زمین پر فساد برپا کرے گا تو اللہ جل جلالہ نے ارشاد فرمایا: میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے میں چاہتا ہوں کہ ایسی مخلوق کو خلق کروں جس کی نسل سے انبیاؑ' صالح بندے اور ہدایت یافتہ ائمہؑ وجود میں آئیں اور پھر انہی کو زمین پر اپنا خلیفہ قرار دوں۔"

امامت اہل تشیع میں اصولِ دین کا حصہ ہے' ائمہ اہل بیتؑ یعنی جن کی محبت اور اطاعت کا قرآن وسنت نے تقاضا کیا ہے اور انہیں دینی وفکری رہنمائی کے ساتھ ساتھ معاشرے کے قائد کے طور پر پیش کیا ہے۔ اہل سنت بھی اسی طرح اہل بیتؑ سے محبت کے دعوے دار ہیں جس طرح سے کوئی شیعہ البتہ اختلاف دینی وفکری رہنمائی کے ساتھ معاشرے کی قیادت پر ہے۔

ہم ائمہؑ سے محبت کے دعوے دار ہیں اور اسی پر خوش ہیں۔ جہاں اطاعت اور اس سے بڑھ کر فداکاری کا تقاضا ہے وہاں کچھ تو اپنی غفلت اور کچھ حقائق سے ناواقفیت کی بنا پر ان معیارات پر پورے نہیں اترتے جو شیعہ کے لیے ضروری گردانے جاتے ہیں۔ جہاں عام شیعوں کی بات ہے تو وہ بھی امام کے سیاسی کردار پر تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں یا سرے سے ائمہؑ کے سیاسی کردار کے ہی منکر ہیں اس کی وجہ ائمہ کی سیرت سے ناآشنائی کے ساتھ ساتھ مخالفین کا پروپیگنڈا بھی ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ شہید سید سعید حیدر زیدی نے اپنی زندگی میں مکمل کرلیا تھا اور بعد از شہادت نظر ثانی کا کام حجۃ الاسلام سجاد مہدوی صاحب مکمل کیا اور شہید سید سعید حیدر زیدی کے ادارے دار الثقلین نے پہلی مرتبہ ۲۰۱۴ میں شائع کیا۔

قارئین کرام! جیسا کہ آپ کے علم میں ہے ہم اپنے مرحومین کے ایصال ثواب اور بلندیٔ درجات کے لیے معصومینؑ کے حیات طیبہ، سیرت اور فرامین پر مشتمل کتاب پیش کرنے کا اہتمام کرتے رہے ہیں۔ ماہ فروری میں ہماری پیاری باجی شمیم زہرا نقوی کی برسی کے موقع پر اس کتاب کو دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔ ہم دار الثقلین کے انتہائی شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں ہماری رہنمائی فرمائی ساتھ ہی العصر پبلشرز کے جناب ثقلین رضا صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جن کی مکمل توجہ اور خصوصی دلچسپی کی وجہ سے یہ کتابیں اس خوبصورت اور دیدہ زیب انداز میں آپ تک پہنچتی رہی ہیں۔

یہ کتاب ہم پیغمبر آخر الزماں اور امام صاحب العصر والزمانؑ کے توسط سے مومنین کی خدمت میں پیش کررہے ہیں اور ملتجی ہیں کہ ایک سورۂ فاتحہ جملہ مرحومین وشہدائے ملت جعفریہ خصوصاً ہمارے والدین سید نوازش علی نقوی وسیدہ حسن بانو، باجی شمیم زہرا، شہید قمر رضا نقوی، شہید اسد رضا نقوی، سید سلمان رضا نقوی، سید علی حسنین زیدی، سیدہ خورشید حسنین زیدی، شہید پروفیسر سید سبط جعفری زیدی اور شہید سید سعید حیدر زیدی کے ایصال ثواب کے لیے تلاوت فرمادیں۔

والسلام

محتاج دُعا

سید جاوید رضا نقوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۔(۱) وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۔(۲)

امام جعفر صادقؑ کے بارے میں دو آراء

امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں لوگوں کے درمیان دو آراء رائج ہیں۔ یہ دو آراء لوگوں کے دو گروہوں اور دو طرح کی طرز فکر رکھنے والے افراد کی طرف سے ظاہر کی جاتی ہیں، لیکن انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ان آراء کی شکل اور مضمون بھی اور ان کی بنیاد بھی ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہے۔ بلکہ یہ تک کہا جا سکتا ہے کہ بعض معاملات اور متعلقہ مسائل میں ان آراء کے درمیان کامل اشتراک پایا جاتا ہے۔ ان دو آراء کو ہم خلاصے کے طور پر بیان

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۲۳

۲۔ سورۂ انبیا ۲۱۔ آیت ۷۳

کریں گے اور آپ دیکھیں گے کہ اِن دونوں ہی آراء سے آپ کا ذہن بہت زیادہ آشنا ہے اور آپ اب تک اِس انداز سے سوچنے والوں اِس طرح کی باتیں کرنے والوں اور اپنے اِس نقطۂ نظر پر انتہائی تعصب سے کام لینے والوں سے مل چکے ہوں گے۔

جانبدارانہ رائے

پہلی رائے جانبدارانہ رائے ہے اور اس کا اظہار ایسے لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے جو اپنے خیال میں امامؑ کے محب، پیروکار اور موالی شمار ہوتے ہیں، اُن لوگوں کی رائے ہے جو امام جعفر صادقؑ کے صرف نام کے شیعہ ہیں، عمل سے اُن کا کوئی تعلق نہیں، اور وہ رائے یہ ہے کہ:

امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے سے پہلے اور اپنے بعد کے بعض ائمہؑ کے برخلاف ایک ایسی صورتحال (Position) میں تھے، جس میں آپؑ کو احکامِ دین کی نشر و اشاعت کا موقع ملا، آپؑ نے اِس موقع سے فائدہ اُٹھایا، آپؑ کے گھر کے دروازے طالبانِ علم کے لیے کھلے رہتے تھے اور آپؑ نے اپنے دولت کدے پر علم و دانش کی تدریس کی بساط بچھائی ہوئی تھی اور علم و حقیقت کا کوئی بھی پیاسا آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوتا، آپ کھلی آغوش کے ساتھ اُس کا استقبال کرتے۔ آپؑ کے منبرِ درس کے گرد چار ہزار شاگرد جمع ہوئے۔ آپؑ کے شاگردوں کے مکتب خانوں سے بے حساب کتب اور تحریریں معروف و نمایاں شخصیات کے توسط سے مختلف قسم کے علومِ دینی (جیسے فقہ، حدیث و تفسیر) سے لے کر علومِ طبیعی تک (جیسے تاریخ و اخلاق و علمِ اجتماع وغیرہ) اہلِ عالم کے سامنے پیش کیے گئے۔ آپؑ نے مختلف صاحبانِ فکر اور دوسرے مذاہب سے وابستہ افراد کے ساتھ بحث و مناظرے کا سلسلہ شروع کیا اور جہاں کہیں کوئی ملحد، زندیق، نیچری، مادہ پرست اور منکرِ خدا ہوتا وہاں آپؑ بنفسِ نفیس خود یا آپؑ کا کوئی شاگرد اُس کے ساتھ بحث کے لیے بیٹھتا اور اُسے ہار ماننے پر مجبور کر دیتا۔ آپؑ نے اپنے زمانے کے متکلمین کے ساتھ اعتقادی اور کلامی مسائل میں پنجہ آزمائی کی اور میدانِ علم و دانش کے ایک سورما کی مانند ہر مدعی،

معارض، فضول گو اور بے بنیاد فکر رکھنے والے کو شکست سے دوچار کیا اور ایک بلند حوصلہ معلم کی طرح مسلسل کئی برس کی کاوشوں کے ذریعے ممتاز اور نمایاں شاگرد پیدا کیے۔

اپنے اس حوزۂ علمی کی بقا اور حفاظت کے لیے اور فکر اسلامی کے اس مکتب کی زیادہ سے زیادہ ترویج کی خاطر آپؑ اس بات پر مجبور ہوئے کہ سیاست میں مداخلت نہ کریں۔ نہ صرف ان معنی میں کہ اپنی طرف سے کسی سیاسی عمل کا آغاز نہ کریں بلکہ اس صورت میں بھی کہ بسا اوقات ہو بہو اسی سیاسی جہت پر چلیں جس پر آپؑ کے زمانے کے خلفا چاہتے تھے اور انھیں اپنے بارے میں خوش بین بھی بنائیں اور کوشش کریں کہ آپؑ سے اُن کی سیاست کے برخلاف کوئی کام سرزد نہ ہو۔

لہٰذا نہ صرف آپؑ نے اپنے زمانے کے حکمرانوں سے کوئی ٹکراؤ مول نہ لیا بلکہ حد یہ ہے کہ دوسروں کو بھی اِن کی مخالفت کرنے سے منع فرمایا۔ اگر کبھی لازم ہوتا تو آپؑ اُن کے یہاں حاضر ہوتے اور اُن سے صلہ اور انعام وصول کرتے۔ اور اگر کسی مخالفانہ تحریک، سوئے ظن اور جھوٹی چغل خوری کی وجہ سے وہ اِن سے بدگمان ہوتے اور غیظ وغضب کا اظہار کرتے تو آپؑ نرمی اور خوش رفتاری سے کام لیتے۔ آپؑ کے اِس موقف پر قطعی اور ناقابلِ تردید شواہد میں سے ایک شاہد ربیع حاجب کی روایت ہے اور اِسی طرح کی دوسری روایات ہیں جن میں امامؑ کو منصور کے سامنے ایک پشیمان اور نادم مجرم کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور امامؑ کی زبانی منصور کے لیے ستائشی کلمات نقل کیے گئے ہیں جبکہ منصور جیسے سرکش فرد کے لیے ان باتوں کا جھوٹ ہونا کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آپؑ اُسے یوسفؑ ایوبؑ اور سلیمانؑ جیسے انبیا کی مانند قرار دیتے ہیں اور اُس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ آپؑ یا بنی حسنؑ کی جانب سے جن بدرفتاریوں کا مشاہدہ کر رہا ہے اُن پر صبر کرے۔

”إِنَّ سُلَيْمَانَ أُعْطِيَ فَشَكَرَ. وَإِنَّ أَيُّوبَ ابْتُلِيَ فَصَبَرَ. وَإِنَّ يُوسُفَ ظُلِمَ فَغَفَرَ. وَأَنْتَ أَسْمَحُ مِنْ ذٰلِكَ السِّنْخِ ......“

سلیمانؑ عطائے الٰہی کے ذریعے حکومت پر فائز ہوئے تو شکر کیا، ایوبؑ جسمانی اور روحانی

بلا میں مبتلا ہوئے تو صبر کیا' یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کی طرف سے ظلم سہا تو انھیں معاف کیا تم بھی اُسی نسب اور گھرانے سے وابستہ ہو۔(۱)

امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں ایک رائے یہ ہے' اور اِس رائے کے مطابق امامؑ ایک دانشور' ایک عظیم مدرس' ایک اہلِ علم' ایک محقق' معلومات کا ایک بے کراں سمندر نظر آتے ہیں کہ جن کے بارے میں ابوحنیفہ نے یہ کہا ہے اور مالک نے وہ کہا ہے لیکن دین کو کمزور کرنے والے عوامل کے سامنے ڈٹ جانے' تحریف سے اسلامی نظریات کی حفاظت کرنے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض پر عمل کے اعتبار سے اور انسان مخالف اور دین دشمن حکمرانوں کے خلاف ایک مناسب موقف اختیار کرنے کے حوالے سے آپؑ کی سرگرمیاں صفر بلکہ اس سے بھی نیچے ہیں اور اِس موقع پر آپؑ زید بن علیؑ' محمد بن عبداللہؒ' حسین ابن علیؒ (شہید فخ) اور حتیٰ اُن کے ساتھ جان کی بازی لگانے والے مجاہدین سے بھی کوسوں دور ہیں۔

اسلامی معاشرے پر جو کچھ گزر رہی ہے آپؑ میں اُس کے بارے میں ذرہ برابر احساسِ ذمے داری نہیں پایا جاتا۔ آپؑ کو اِس بات کا بالکل غم نہیں کہ منصور عباسی مسلمانوں کے غصب کیے ہوئے اموال میں سے لاکھوں درہم و دینار ہڑپ کیے بیٹھا ہے۔(۲) جبکہ طبرستان اور مازندران کے پہاڑوں اور عراق اور ایران کے بہت سے شہروں اور دیہاتوں میں پیغمبر اکرمؐ کے سچے فرزندوں (اُن پاکیزہ عناصر اور پرجوش لہو رکھنے والے افراد) کے پاس اِتنی غذا بھی نہ تھی جس

۱۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے اِس مضمون کی آٹھ روایات میں کوئی سند نقل نہیں کی گئی ہے اور فقط قصہ بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے اور ایک روایت میں معلوم نہیں ہوتا کہ راوی کس کی بات نقل کر رہا ہے اور مسلمہ طور پر وہ خود اس مجلس میں موجود نہیں تھا۔ صرف ایک روایت میں راوی یہ بات امامؑ سے نقل کرتا ہے البتہ غیر معتبر سند سے۔

رجوع کیجیے: بحار الانوار ج ۴۷۔ ص ۱۸۲ اور قاموس الرجال۔ ج ۹۔ ص ۵۰۹

۲۔ جب منصور کی موت واقع ہوئی تو اُس کے خزانے میں ۶ سو ملین درہم اور ۱۴ ملین دینار نقد رقم کی صورت میں موجود تھے۔ عصر الازدھار۔ ص ۶۰ سے ۷۰

سے وہ اور اُن کے بیوی بچے ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھا سکیں اور اتنے کپڑے بھی نہ تھے کہ وہ لوگ ایک نماز جماعت واجب ستر کے ساتھ ادا کر سکیں اور اُن کے شیعہ اور وفادار مسلسل قتل و غارت اور تعذیب کے خطرے کا شکار تھے اور اپنے زمانے کے دوسرے لوگوں کی طرح آسودہ زندگی بسر کرنے سے عاجز تھے۔

یہ رائے رکھنے والے افراد خیال کرتے ہیں کہ اِس صورتِ حال کے مقابل امام صادقؑ میں کسی قسم کی حساسیت نہیں پائی جاتی تھی' کوئی احساسِ ذمے داری نہ تھا۔ آپؑ محض اِس بات پر خوش تھے کہ ابن ابی العوجا یا کوئی اور ملحد آتا ہے' اُن کے حضور بیٹھتا ہے اور وہ خود یا اُن کا کوئی شاگرد اُس سے مقابلہ کرتے ہیں اور وہ شکست خوردہ اور مغلوب ہو کر اُن کی مجلس سے جاتا ہے' البتہ وہ کسی صورت مسلمان نہیں ہوتا۔

اِس اوّل الذکر موقف کی رو سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی شخصیت یہ ہے۔

مفاد پرستانہ رائے

دوسری رائے مفاد پرستانہ رائے ہے۔ ایسے لوگوں کی رائے ہے جو امام صادق علیہ السلام کو ایک امام نہیں سمجھتے بلکہ اُنھیں تاریخ میں ایک ناقابلِ انکار حقیقت کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ اور اُن کے بارے میں کوئی موقف اختیار کرنے سے قبل اُن کی زندگی کا جائزہ لینا اور انہیں تاریخ کے آئینے میں دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں اور پھر اِس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ منصبِ امامت (وہ منصب جو اُن کے طرفداروں کے عقیدے کے مطابق دین اور دنیا کی قیادت ہے) اُن پر جچتا ہے اور ایک عظیم اور لائق انسان کے طور پر اُن کی تکریم کو قبول کیا جانا چاہیے یا یہ منصب اُن پر نہیں جچتا لہٰذا اُن کی طرف سے منہ پھیر لینا چاہیے اور اُن پر طعنہ زنی کرنی چاہیے۔

کیا اِس رائے کا اظہار کرنے والے اِس گروہ نے قابلِ اعتنا مدارک (Sources) یا بنیادی طور پر کسی مدرک سے رجوع کیا ہے اور کیا وہ امام صادقؑ کا صحیح چہرہ دیکھ بھی پایا ہے؟ یا اِس بارے میں بحث و گفتگو اور مدارک کے جائزے کے بغیر امامؑ کے بارے میں صرف سُنی

سنائی باتوں یا اپنے تصورات پر اکتفا کیا ہے اور اِن کی بنیاد پر اپنا نظریہ صادر کیا ہے؟ ہم جو کچھ اس باب میں پیش کریں گے شاید آپ اُس کے مطالعے کے بعد اِس بارے میں صحیح فیصلے اور درست رائے تک پہنچ سکیں۔ فی الحال ہم اِس گروہ کی رائے جو مفاد پرستانہ ہے' بیان کررہے ہیں۔

انسانیت کے حوالے سے ایک رہبر کی ذمے داری

کہتے ہیں کہ جس زمانے میں اسلامی معاشرہ اور زیادہ صحیح الفاظ میں نام کا مسلمان معاشرہ (کیونکہ اسلامی معاشرہ بنیادی طور پر ایک دوسری ہی چیز ہے) طبقاتی اختلافات کی آگ میں جھلس رہا تھا' جس زمانے میں معاشرے میں نمایاں ترین نظر آنے والی چیزیں ظلم وستم اور سرکشی کی علامتیں تھیں اور جابر حکمرانوں کے ہاتھوں نے لوگوں کی جان ومال' عزت وآبرو سے بھی بڑھ کر اُن کے اذہان' قلوب اور احساسات کو اپنے شکنجے میں کسا ہوا تھا اور وہ جو چاہتے اِن لوگوں کے ساتھ جو بتدریج ایک انسان کی اہم ترین خصوصیت (یعنی سوچ وبچار اور انتخاب کی قوت) کھو چکے تھے' انجام دیتے تھے۔ جس زمانے میں ہزاروں کچے گھروندوں اور جھونپڑوں کے سامنے منصور کا افسانوی محل "الحمرا" سر اٹھائے کھڑا نظر آتا تھا' جس دور میں منصور کے قید خانوں میں معاشرے کے معزز ترین عناصر کے خلاف بدترین غیر انسانی ہتھکنڈوں سے کام لیا جاتا تھا۔ ایسے ظلم وستم سے بھرے اور ناقابلِ برداشت زمانے میں امام جعفر صادقؑ کا اپنا اہم ترین کام درس وبحث' تحقیق اور شاگردوں کی تربیت قرار دینا' دروس کے حلقے اور فقیہ ومتکلم سازی کی درسگاہ قائم کرنا اِس بات کی غمازی کرتا ہے کہ (نعوذ باللہ) وہ انسانیت کے حوالے سے ایک قائد ورہبر کی ذمے داری سے غافل ہیں؟ یا اِس سے بے اعتنا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں یہ غیر منصفانہ' بے بنیاد اور سطحی آراء اور موقف جو اِن دو گروہوں کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں' اور جن میں سے پہلا گروہ آپؑ کی طرفداری اور پیروی کا دعویٰ بھی کرتا ہے' ناقابلِ معافی اور انتہائی قابلِ مذمت ہیں۔

امامؑ کی حقیقی تصویر

ہمارا ارادہ یہ نہیں ہے کہ ہم تحقیق کی عام اور رائج روش کے مطابق امامؑ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام مدارک اور منابع کو یہاں پیش کریں' روایات کی سند کا جائزہ لیں اور روایات کو ایک دوسرے کے ساتھ جمع کرتے ہوئے ان کی تشریح وتوضیح کے ذریعے کسی نتیجے تک پہنچیں' یہ کام علمی مجالس ومحافل کا ہے نہ کہ تقریری محافل کا۔ ہم ان دو آراء کے مقابل ایک تیسری رائے پیش کریں گے اور عام اور رائج مآخذ سے اس کے ناقابلِ تردید شواہد وقرائن آپ کے سامنے رکھیں گے اور آپ نزدیک سے مشاہدہ کرنے والے ایک شخص کی مانند انہی مدارک' کتب اور روایات کے دریچے کہ جن میں سے بہت سی روایات کو شاید آپ نے سنا بھی ہوگا (اور ممکن ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے انہیں بیان کیا اور لکھا ہوگا' انہیں خود بھی پتا نہ ہو کہ یہ کس پیام کی حامل ہیں) سے امامؑ کی حقیقی شخصیت کا نظارہ کیجیے اور آپؑ کی زندگی کے بارے میں ایک منصفانہ رائے جانیے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اپنی تفصیلی بحث کا آغاز کریں اس نکتے کی یاددہانی مفید سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی رائے صحیح اور قابلِ اعتماد بنیادوں پر استوار نہیں۔

عافیت طلب مزاج

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ {امامؑ کے بارے میں پیش کی جانے والی} پہلی رائے چند روایات پر استوار ہے (۱)۔ البتہ ان روایات کا مضمون عافیت طلب مزاج سے مکمل طور پر ہم آہنگ اور اُس کے لیے قابلِ قبول ہے' ایسے موقع پرست لوگوں کے لیے قطعی حجت ہے جو ہمیشہ معقول اور شرعی بہانوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جب (نعوذ باللہ) امام جعفر صادق علیہ السلام اس قدر آگے بڑھ سکتے ہیں کہ مدبرانہ انداز سے اور جھوٹی ستائش سے دور رہتے ہوئے کوئی جواب دینے کی بجائے ایسی چاپلوسی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اُن کے شاگرد' پیروکار اور وہ تمام لوگ جو امامؑ

۱۔ جس کی طرف ہم نے صفونمبر ۱۳ کے حاشیے پر دی گئی وضاحت میں اشارہ کیا ہے

سے نیچے ہیں؛ اُنھیں حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی خاطر کسی بھی سطح تک جا سکتے ہیں۔۔۔ ہمارے خیال میں اِن روایات کو بے قدر و قیمت قرار دینے کے لیے اِن کا متن ہی کافی ہے۔ اِس لیے کہ اِس صورت میں جبکہ امام ایک مختلف انداز سے اور ایک مناسب ترین بیان کے ذریعے اپنے آپ کو قتل کے خطرے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں (جیسا کہ اِس طرح کے بیانات کے نمونے ہم دوسری معقول اور قابلِ قبول روایات میں دیکھتے ہیں) تو کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جس کے تحت آپؑ چاپلوسی اور بے جا ستائش کے مرتکب ہوں اور منصور جیسے سرکش انسان کو ایسی فتنہ انگیز دروغ گوئیوں کے ذریعے رحم پر آمادہ کریں اور اپنے بیان کے ذریعے منصور کے لیے حق وحقیقت کے برخلاف ایک مقام معین کریں۔ بلاتردد امامت کا بلند مقام ومرتبہ اِس سے کہیں زیادہ پاکیزہ اور ارفع واعلیٰ ہے کہ اُس کے بارے میں ایسی اخلاقی آلائش کا گمان بھی کیا جا سکے۔

وہ اسناد جنھیں سند قرار نہیں دیا جا سکتا

اِن روایات پر سند کے لحاظ سے بھی غور وخوض انتہائی سبق آموز اور عبرت ناک ہے۔ اِن میں سے چند روایات میں "ربیع حاجب" کا نام نظر آتا ہے اور حدیث کا سلسلۂ سند اُس پر منتہی ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں ربیع' منصور کا مشیر خاص اور اُس دور کی اصطلاح میں اُس کا حاجب (دربان) تھا۔ اب اِس سے آپ اُس کی عدالت کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ جیسا کہ منابع سے ظاہر ہوتا ہے' یہ شخص منصور کے دربار میں سب سے زیادہ اُس سے نزدیک اور اُس کا انتہائی قابلِ اعتماد آدمی تھا۔ اور ۱۵۳ ہجری میں (امام جعفر صادقؑ کی شہادت کے تقریباً پانچ سال بعد) وہ وزارت کے منصب پر بھی فائز ہوا(۱) یعنی اُس کی ترقی ہوئی (شاید یہ اُن دروغ گوئیوں

۱۔ وہ منصور کا دوسرا اور آخری وزیر تھا۔ ایک عاقل اور کارآمد زیرک' پر ہیبت' فصیح اور باتدبیر شخص تھا جو منصور کی زندگی کے اختتام (۱۵۸ ہجری) تک وزارت کے منصب پر فائز رہا۔ منصور (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کا صلہ تھا جو اُس نے امام جعفر صادقؑ کے بارے میں گھڑی تھیں)۔ ایک ایسا شخص جس کے دربار خلافت کے ساتھ اخلاص اور وفاداری کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا' وہ اگر امام جعفر صادقؑ کی زبان سے کوئی خوشامدانہ کلام گھڑ دے یا ایسی بات جسے تندو تیز لہجے میں کہا گیا ہو' اُسے گڑگڑانے کے انداز میں نقل کردے تو اُس نے کوئی ایسا خلافِ توقع کام انجام نہیں دیا ہے۔ خلافِ توقع بات یہ ہے کہ کوئی عاقل انسان خلیفہ کے ایک دشمن کے بارے میں خلیفہ کے وفادار شخص کے کلام پر یقین کرلے اور سادہ لوحی کے ساتھ اُس کے شیعہ ہونے کے دعوے (جو اُن گھٹیا سازشوں کا حصہ ہے) کو قبول کرلے۔

غیر علمی رائے

دوسری رائے بھی اسی طرح کمزور اور غیر علمی ہے۔ یہ مستشرقین کی رائے کے مشابہ ہے جو اکثر مفاد پرستی سے آلودہ یا جہل اور بے خبری کی بنیاد پر ہوتی ہے' اُنہی خصوصیات کے ساتھ' اُنہی بے روح' خشک' مادہ پرستانہ اور تنگ نظری پر مبنی نقطہ ہائے نظر کی طرح۔ اور درحقیقت یہی وہ اوّلین افراد ہیں جنہوں نے اکثر ائمہ شیعہ کے بارے میں اس قسم کی باتیں منہ سے نکالی ہیں' بالکل اُسی طرح جیسے متعدد مقامات پر مسائل اسلام' تشیع اور بزرگانِ اسلام کی زندگیوں کے بارے میں اُن کے نقطۂ نظر میں جہل یا مفاد پرستی کی بنیاد پر وہی فضول باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہم

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) اور بنی عباس سے اُس کی وفاداری کے بارے میں بس یہی کہہ دینا کافی ہے کہ ایک بحرانی صورتحال اور ایسی حالت میں جبکہ منصور کے چچاؤں اور اُس کے دیگر ورثا کے درمیان داخلی اختلافات کا بہت زیادہ امکان پایا جاتا تھا اور جس نے بنی عباس کو زوال کے خطرے سے دوچار کردیا تھا' ربیع وہ واحد فرد تھا جس نے اس ٹوٹتے بکھرتے گھرانے کو جوڑا۔ اس نے منصور کی زبانی ایک وصیت نامہ تیار کیا اور اُس کی زندگی کے آخری لمحات میں تمام سرداروں' پرچم داروں' حکام اور گورنروں سے (منصور کے بیٹے) مہدی کے لیے بیعت لے لی اور خلافت کے مدعی دوسرے لوگوں کو ایک انجام شدہ عمل کے مقابل کھڑا کردیا۔ رجوع کیجیے عصر الازدھار۔ ص ۵۹ اور ۷۰

ایک ایسے مستشرق(۱) کو جانتے ہیں جو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے قیام کی بابت فقط اتنا جانتا ہے کہ اُنھوں نے (نعوذ باللہ) پیسہ لے کر خلافت معاویہ کے حوالے کر دی اور عطر' عورت اور زیب و زینت کے درمیان اپنی زندگی بسر کی! اور ایک دوسرا مستشرق (۲) جو تاریخ کے بارے میں ایک نظریے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام کو ایک ایسے نقطۂ انقلاب (Turning point) کے طور پر پیش کرتا ہے جو اپنے زمانے کے معاشروں کو غلامی سے جاگیردارانہ نظام (feudalism) میں منتقل کرنے کا سبب بنا! اور اپنی بے بنیاد کھوکھلی اور غیر مربوط تحقیقات کے ساتھ اِسی طرح کے دوسرے مستشرقین ۔۔۔ پس اگر ہم اِن کی جانب سے امام جعفر صادق ؑ کے بارے میں بھی اِسی قسم کی غیر علمی اور بغیر چھان بین کے اختیار کردہ آراء کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اِن مفاد پرست لوگوں کا منبع (Source) اُس پہلے گروہ کی گھڑی ہوئی باتوں کے سوا کچھ اور نہیں ہے وگرنہ کس تحقیقی نقطۂ نظر کے ذریعے ائمہ ؑ کی زندگی کو ایسی نامعقول روش تک محدود کیا جاسکتا ہے۔

فلسفۂ امامت

اب ہم امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں تیسری بات عرض کریں گے۔ منابع و مآخذ کو دیکھنے کے بعد جو چیز ہر اہلِ نظر اخذ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ صرف چھٹے امام ؑ کی زندگی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک عمومی بات ہے جس میں تمام شیعہ ائمہ ؑ کو شامل سمجھنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ اِن میں سے ہر ایک کا عمل اپنے زمان و مکان کی خصوصیات کے تناسب سے مختلف ہے لیکن اِن کے کام کی روح اور حقیقت ایک ہی ہے اور سب ایک ہی راہ پر گامزن اور ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔

امام ؑ کی زندگی کی مجموعی روش جاننے کے لیے سب سے پہلے ہمیں فلسفۂ امامت کو جاننا ہوگا۔ مکتبِ تشیع میں امامت کے نام سے یہ سلسلہ معروف ہے اور تقریباً ۲۵۰ سال (۱۱ ہجری

۱۔ کتاب تاریخِ عرب کا مؤلف یہودی مستشرق فلپ ہٹی۔

۲۔ روسی مورخ اور محقق کتاب اسلام در ایران کا مؤلف پطروشفسکی۔

سے لے کر ۲۶۰ ہجری تک) پر محیط عرصے میں اس کے اصل عناصر معین اور مشخص گیارہ افراد پر مشتمل ہیں اور یہ درحقیقت نبوت کا تسلسل ہے۔

نبی اپنے مقاصد اور پروگرام ایک نئی آئیڈیالوجی انسانی زندگی کے لیے ایک نئے خاکے اور انسانیت کے لیے ایک پیغام کے ساتھ مبعوث ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے سالہا سال ایک تعمیری جدوجہد میں گزارتا ہے اور امانتِ الٰہی کے سنگین بوجھ کو اس مقام تک آگے بڑھاتا ہے جہاں تک اُسے اُس کے زمانے کے حالات اور اُس کی زندگی اجازت دیتی ہے۔ محدود مدتِ حیات میں ایک انسان کسی صورت کامل ترین اور پختہ ترین نتائج حاصل نہیں کرسکتا۔ اس سلسلے میں مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس مشن کو ایسے فرد یا افراد (جو تمام بنیادی پہلوؤں میں نبی سے نزدیک ترین اور مشابہ ترین ہوں) کے سپرد کرنا چاہیے جو یہ بارِ امانت ایک ایسے مقام تک پہنچا سکیں جہاں یہ محفوظ باقی اور مستقبل میں جاری وساری رہ سکے۔ یہ فرد یا افراد اوصیائے پیغمبر اور ائمۂ اُمتؑ ہیں۔ اور تمام بڑے انبیا اور پیغمبرانِ الٰہیؑ اوصیا اور جانشین ہوا کرتے تھے۔

فلسفۂ نبوت

وحی اور امام کا عہد و پیمان (بالفاظِ دیگر امامت کا تفصیلی فلسفہ) جاننے کے لیے پیغمبری ذمے داریاں، نبوت کا فلسفہ اور ان کے فرائض جاننے کی ضرورت ہے: "لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔" (۱) ہم نے انبیا کو قطعی اور ناقابلِ تردید علامات کے ساتھ بھیجا ہے اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان (ایک نیا مکتب اور جدید معیار و ضوابط) ارسال کیے ہیں، تاکہ لوگ عدل و انصاف پر مبنی زندگی بسر کریں اور ایک عادلانہ اور رہنے کے قابل معاشرہ تشکیل دیں۔

۱۔ بیشک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔ سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۲۵

یہ اُن آیات میں سے ایک آیت ہے جس میں نبوت کا فلسفہ' اُس کی علت اور ایک دوسرے نقطۂ نظر سے انبیاؑ کے فریضے کو واضح کیا گیا ہے۔ انبیاؑ اس لیے تشریف لائے ہیں تاکہ دنیا کو ایک نئی شکل میں تعمیر کریں' اس میں موجود خرابیوں کا سدِباب کریں اور جاہلی زمانے کے ماحول میں ایک انقلاب وجود میں لائیں' جیسا کہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ (وحی اور قرآن کے ترجمان) اپنی حکومت کے آغاز پر فرماتے ہیں: "حَتَّى يَعُودَ أَسْفَلُكُمْ أَعْلَاكُمْ وَ أَعْلَاكُمْ أَسْفَلَكُمْ "(۱) پست بنائے گئے مظلوموں کو بلند مقام دو اور بلند مقام پر بیٹھے غیر مستحق لوگوں کو نیچے اتار دو۔۔۔۔ مختصر یہ کہ توحید' عدلِ اجتماعی' احترامِ انسانیت' تمام گروہوں اور افراد کے لیے برابر کی آزادی' حقوق اور قوانین میں مساوات' استحصال' استبداد اور اجارہ داری کی نفی کی بنیاد پر ایک معاشرہ تشکیل دیں۔ یعنی متحمل' مطمئن' انسانی صلاحیتوں کو نکھارنے والا' غور و فکر اور حصولِ علم کی ترغیب دینے والا' مختصر یہ کہ ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھیں جو تمام پہلوؤں میں انسان کی تربیت اور نشوونما کا گہوارہ ہو اور اُسے اُس کے تاریخی تکامل کی راہ میں اس اہم ترین مقصد سے ہمکنار کرائے۔ یہ ہے وہ ذمے داری جس کی ادائیگی کے لیے انبیائے الٰہیؑ کو مبعوث کیا گیا ہے۔

امامت نبوت کی ذمے داری کا تسلسل

ہم یہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ امامت (اس لحاظ سے نبوت کا تسلسل اور اسی راہ پر سفر ہے) بھی اسی بارِ امانت کی حامل اور اسی ذمے داری کی ادائیگی پر مامور ہے۔

اگر پیغمبرِ اسلامؐ ڈھائی سو (۲۵۰) سال زندہ رہتے تو کیا کرتے' کس سمت گامزن ہوتے؟ امام اور پیغمبرؐ کے وصی کا عمل اور راہ (Direction) ہو بہو وہی ہے۔ امامت کا مقصد اور اُس کی راہ وہی ہے جو نبوت کا مقصد اور اُس کی راہ ہے۔ یعنی ایک عادلانہ اسلامی معاشرے اور نظام کی تشکیل اور اُسے باقی رکھنے اور فروغ دینے کی جد وجہد۔

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۶۹

البتہ زمانے کے تقاضے مختلف ہوا کرتے ہیں' اور اسی مناسبت سے ہر زمانے میں مخصوص تدابیر (techniques) اور طرز ہائے عمل سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔ خود پیغمبر اسلامؐ نے اُس زمانے میں جبکہ ابھی نظامِ اسلامی کی تشکیل کا مرحلہ تھا' ایک انداز سے عمل کیا اور اُس وقت جبکہ آپؐ کی مسلسل ثابت قدمی کے نتیجے میں اِس مقصد کا حصول قریب نظر آ رہا تھا' ایک اور طرح سے عمل کیا۔۔۔ اور پھر اُس موقع پر جبکہ آپؐ کا آئیڈیل نظام تازہ تازہ وجود میں آیا تھا' اور ابھی آپؐ اُس میں کچھ کمزوریاں محسوس کر رہے تھے' تو آپؐ نے اُس کی بقا اور دوام کے لیے کچھ تدابیر اختیار کیں' اور آخر کار جب آپؐ نے خود اپنے قائم کیے ہوئے نظام کو مستحکم پایا' تو کچھ اور تدابیر اپنائیں۔ البتہ جو چیز ہمیشہ برقرار اور یکساں رہی' وہ آپ کی وہی سمت (Direction) اور بلند مقصد تھا جس کے لیے آپ مبعوث کیے گئے تھے' اور جس کی خاطر آپؐ نے اپنی زندگی وقف کی ہوئی تھی' یعنی ایک ایسا ماحول اور نظام ایجاد کرنا' اُسے قائم اور برقرار رکھنا جس میں انسان اپنی ہر جہت اور ہر پہلو میں علو (رفعت) اور بلندی حاصل کر سکے اور اُسکے وجود میں جو صلاحیتیں اور توانائیاں رکھی گئی ہیں' اُن سے استفادہ کر سکے۔

ائمۂ شیعہ کا' خود پیغمبرؐ کی طرح اِس کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا کہ اِنہی خصوصیات اور اِسی سمت اور اِسی رُخ کے حامل ایک عادلانہ اسلامی نظام کی بنیاد رکھیں اور اگر اِس قسم کا نظام موجود ہو' تو اُسے قائم و دائم رکھیں۔

اجتماعی نظام کے تعمیری عناصر

ایک اجتماعی نظام کی بنیاد ڈالنے' یا اُسے قائم و دائم رکھنے کے لیے کن تعمیری عناصر کی ضرورت ہوا کرتی ہے؟ سب سے پہلے ایک رہنما اور سمت و رُخ متعین کرنے والی آئیڈیالوجی' جو دراصل اِس نظام کا خاکہ اور نقشہ گار (road map) ہوتی ہے۔ اِس کے بعد ایک قوتِ اجرائی جو اِس نظام کے جامۂ عمل پہننے کی راہ میں درپیش مزاحمتوں اور مشکلات کا تدارک کرے۔

ہم جانتے ہیں کہ ائمہؑ کی آئیڈیالوجی اسلام کی آئیڈیالوجی ہے اور اسلام انسان کے لیے

ایک جاویداں مکتب ہے' ایک ایسا مکتب جو مخصوص خصوصیات (۱) کا حامل ہونے کی بنا پر اپنی جاویدانی اور دائمی بقا کا امکان فراہم کرتا ہے۔

ائمہ کا عمومی لائحۂ عمل

ان باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم ائمۂ شیعہ اور رسولِ اسلامؐ کے برحق جانشینوں کے عمومی لائحۂ عمل کو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ لائحۂ عمل (programe) دو اٹوٹ حصوں میں انجام پاتا ہے: پہلا حصہ آئیڈیالوجی سے تعلق رکھتا ہے' اور دوسرا حصہ سماجی قوت وطاقت کے حصول سے۔

پہلے حصے کے حوالے سے اِن حضرات کی کوشش اور جدوجہد اسلامی آئیڈیالوجی کی تفہیم و تشریح' اس کے نفاذ اور مفاد پرست گروہوں اور جاہل اذہان کی جانب سے اس میں پیدا کی جانے والی تحریفات اور بدعتوں کی نشاندہی کی جانب مرکوز تھی۔ یہ حضرات اس آئیڈیالوجی کو مسلسل تغیر پذیر معاشرتی زندگی اور نت نئے حوادث پر تطبیق دیتے اور مستقبل میں آنے والوں کو حوادثِ واقعہ کے حکم سے استفادے کا طریقہ سکھاتے۔ اس [اسلامی آئیڈیالوجی] کے اِن حصوں کو جو حکمراں طبقات کے مفادات سے متصادم ہونے کی بنا پر مبہم رہ گئے تھے' یا جنہیں فراموش کردیا گیا تھا' انہیں لوگوں کے اذہان میں زندہ کرتے اور اس کے اُن گوشوں کو جو عام ذہن اسلام کے بنیادی سرچشمے (Primary Source)' یعنی قرآن سے استخراج نہیں کر سکتے تھے' اُن کا اپنے عبور اور کامل معرفت کی بنیاد پر استخراج کرتے۔ مختصر یہ کہ اسلام کو ایک زندہ اور زندگی بخش آئیڈیالوجی کے عنوان سے صدیوں کے لیے محفوظ کردیں اور اس کی تاابد حفاظت کے طریقوں کی اپنے شاگردوں اور آئندہ آنے والی نسلوں کو تعلیم دیں۔

۱۔ انسان کی بنیادی اور ثابت ضروریات کے مطابق اس کی نقشہ کشی' لچک کی قابلیت اور (اپنے مکتب کی اصولی سمت کی حفاظت اور مکتب کے فراہم کردہ تصورِ کائنات پر منطبق ہونے کی صورت میں) ہر جگہ اور ہر قسم کے منطقی اور علمی عناصر کو جذب کرنے کی صلاحیت' اِن خصوصیات میں سے ہیں۔

دوسرے حصے کے حوالے سے بھی یہی کوشش کی' کہ ہر زمانے میں اسلامی معاشرے کی سیاسی واجتماعی اور عالمی صورتحال کے تناسب سے ایسے مقدمات اور وسائل فراہم کریں جو سرعت سے زمام قدرت واختیار ان کے ہاتھ میں دے سکیں' یا طویل مدت بعد خود انھیں یا ان کے ہم فکر افراد' ساتھیوں یا ان کے جانشینوں کو حکومت اور اقتدار تک پہنچا دیں۔

یہ ائمہؑ اطہار علیہم السلام کی زندگی اور سرگزشت کا مختصر خلاصہ ہے' یہی وہ چیز ہے جس کی خاطر وہ زندہ رہے اور جس کی راہ میں شہید ہوئے ۔۔۔۔ اگر تاریخی حقائق اس سرگزشت حیات کی صحت کی گواہی نہ بھی دیں [تب بھی] ائمہؑ کے شیعہ اپنے ایمان اور عقیدے کے تحت ان بزرگوں کے بارے میں نہ اس کے سوا کچھ سوچ سکتے ہیں اور نہ کہہ سکتے ہیں ۔۔۔۔ بہر صورت تاریخ کی گواہی ہر محقق کے لیے کافی اور اسے مطمئن کرنے والی ہے۔

امامت کے چار ادوار

سلسلۂ امامت (آغاز غیبت سے قبل) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت (ماہ صفر ۱۱ ہجری) کے روز ہی سے وجود میں آ گیا تھا اور امام حسن عسکری علیہ السلام کی وفات (ماہ ربیع الاوّل ۲۶۰ ہجری) تک مسلمان معاشرے کے درمیان جاری رہا تھا۔ اس مدت میں امامت قریب قریب چار ادوار سے گزری ہے اور ان میں سے ہر دور میں ائمہؑ نے اسلامی معاشرے پر مسلط سیاسی قوت کے مقابل ایک مخصوص موقف اختیار کیا ہے۔

پہلا دور: خاموشی یا تعاون

پہلا دور ان حکومتوں کے مقابل امامؑ کی خاموشی یا ان کے ساتھ تعاون کا دور ہے۔ اسلام کا نومولود اور نیا نیا وجود میں آنے والا معاشرہ' تازہ مسلمانوں کی موجودگی' داخلی عدم پختگی اور طاقتور اور زخم خوردہ بیرونی دشمنوں کی موجودگی کے باعث کسی بھی صورت میں باہمی صف آرائی اور اختلاف کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس معاشرے کے پیکر میں معمولی سا رخنہ بھی اس کی اصل

اساس اور بنیاد کے لیے ایک خطرہ بن سکتا تھا۔ دوسری طرف حق وحقیقت سے انحراف کا پہلو اس قدر آشکار نہ تھا کہ امیر المومنین جیسی شخصیت (جو خود دین کے سب سے زیادہ وفادار اور اسلامی معاشرے کے حوالے سے دردمند ترین انسان تھے) کے لیے قابلِ برداشت نہ ہو اور شاید ان ہی وجوہات کی بنا پر جو پہلے ہی سے پیغمبر اکرمؐ کے ذہن میں تھیں' آنحضرتؐ نے اپنے اس ممتاز شاگرد کو حکم دیا تھا کہ وہ اس قسم کے حوادث کے مقابل صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں۔

یہ دور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت (۱۱ ہجری) اور امیر المومنینؑ کی خلافت کے آغاز (۳۵ ہجری) کے درمیان کے مسلسل پچیس برسوں پر محیط ہے۔ حضرت علیؑ نے اہلِ مصر کے نام اپنے خط میں اس دور کے آغاز پر اپنی حالت کو اس انداز سے بیان کیا ہے:

"فَأَمْسَكْتُ يَدِي حَتَّى رَأَيْتُ رَاجِعَةَ النَّاسِ قَدْ رَجَعَتْ عَنِ الْإِسْلَامِ، يَدْعُونَ إِلَى مَحْقِ دِينِ مُحَمَّدٍ (ص) فَخَشِيتُ إِنْ لَمْ أَنْصُرِ الْإِسْلَامَ وَ أَهْلَهُ أَنْ أَرَى فِيهِ ثَلْماً أَوْ هَدْماً تَكُونُ الْمُصِيبَةُ بِهِ عَلَيَّ أَعْظَمَ مِنْ فَوْتِ وِلَايَتِكُمْ ---- فَنَهَضْتُ فِي تِلْكَ الْأَحْدَاثِ ----"

"میں نے اپنے ہاتھ کو روک لیا' یہاں تک کہ آنکھوں سے دیکھا کہ پھرنے والے اسلام سے ہی پھر گئے اور محمدؐ کے دین کو ملیا میٹ کرنے کی دعوت دینے لگے' اب میں اس بات سے ڈرا کہ اسلام میں کوئی رخنہ یا خرابی دیکھتے ہوئے بھی اگر میں نے اسلام اور اہلِ اسلام کی نصرت نہ کی تو (اس کوتاہی کی وجہ سے) میرے سر پر وہ مصیبت آپڑے گی جو تمہاری حکومت میرے ہاتھ سے نکل جانے (کی مصیبت) سے بھی بڑی ہوگی ---- تو ان بدعتوں (کے ہجوم) میں' میں اٹھ کھڑا ہوا ----" (۱)

اس دور میں حضرت علیؑ کی پچیس سالہ زندگی' اسلام اور مسلمان معاشرے کے لیے آپؑ میں موجود انتہائی دردمندی کی بنیاد پر انجام دیے جانے والے سرگرم کردار' مدد اور تعاون کی عکاسی

۱۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۶۲

کرتی ہے۔ آپؑ کی جانب سے سیاسی، عسکری اور سماجی مسائل کے بارے میں خلفائے وقت کے سوالوں کے جواب اور اُن کی راہنمائیوں کا ذکر نہج البلاغہ اور حدیث و تاریخ کی دیگر کتب میں موجود ہے، جو اپنی زندگی میں اختیار کردہ امامؑ کے اس طریقۂ کار کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

دوسرا دَور: امامؑ کا اقتدار پر فائز ہونا

دوسرا دَور، امامؑ کا دورِ اقتدار ہے۔ یہ دَور امیر المومنینؑ کی چار سال اور نو ماہ اور امام حسن ابن علیؑ کی چند ماہ پر مشتمل خلافت کا دَور ہے۔ یہ انتہائی مختصر ہونے اور بے انتہا مسائل اور مشکلات (جن سے ایک انقلابی حکومت اپنا دامن نہیں چھڑا سکتی) کے باوجود حکومتِ اسلامی کے درخشندہ ترین سال شمار کیے جاتے ہیں۔ حیاتِ اجتماعی میں انتہائی دوٹوک انداز، صراحت اور جرأت کے ساتھ انسانی طرز ہائے عمل، مطلق عدالت اور اسلام کے مختلف پہلوؤں کا ملحوظ رکھا جانا، سب سے زیادہ تاریخ کے اسی دَور میں درج ہے۔

ائمہؑ کی حیات کا یہ دَور، اُس حکومت اور اجتماعی نظام کے لیے ایک نمونہ تھا جس کی جانب اس کے دو (۲) صدی بعد بھی ائمہؑ شیعہ دعوت دیتے تھے، اس راہ میں جدوجہد کرتے تھے اور شیعہ ایک محترم یادگار کے طور پر اس کا ذکر کیا کرتے تھے، اس کی عدم موجودگی پر حسرت اور افسوس کا اظہار کرتے اور بعد کی حکومتوں کا اس کے ساتھ موازنہ کر کے اُن کی مذمت کیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک درس اور سبق آموز تجربہ تھا، جو غیر تربیت یافتہ یا انحراف اور گمراہی کے شکار افراد اور معاشرے کے درمیان ایک انقلابی اور سو فیصد اسلامی حکومت کی صورتحال کی نشاندہی کرتا ہے، اور اُسی دن سے بعد میں آنے والے ائمہؑ کے لیے طویل مدتی، دشوار اور سخت گیر حزبی تربیت کے طریقے اختیار کرنا لازم کرتا ہے۔

تیسرا دَور: صلحِ امام حسنؑ سے شہادتِ امام حسینؑ تک

تیسرا دَور بیس سال پر پھیلا ہوا ہے، جو امام حسنؑ کی صلح (۴۱ ہجری) اور امام حسینؑ کی

شہادت (ماہ محرم ۶۱ ہجری) کا درمیانی زمانہ ہے۔ صلح کے بعد شیعوں نے عملاً نیم مخفی کام شروع کردیا تھا' اور ایک ایسے پروگرام کا آغاز ہوگیا تھا جس کا مقصد خاندانِ رسولؐ کی حکومت کی بازیابی کے لیے ایک مناسب موقع کی فراہمی تھا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ موقع بہت زیادہ دور نہ تھا اور معاویہ کی زندگی کے خاتمے پر اس کی امید پائی جاتی تھی۔ لہٰذا اس تیسرے دور کو "حکومتِ اسلامی کے قیام کے لیے ایک مختصر مدتی تعمیری کوشش کا دور" کا نام دیا جاسکتا ہے۔

چوتھا دور: طویل مدت جدوجہد کا زمانہ

اور آخرکار چوتھا دور' اسی روش کو ایک طویل مدتی پروگرام کی صورت جاری رکھنے کا عہد ہے۔ تقریباً دو صدیوں پر محیط دور' جس کے مختلف مراحل میں کبھی کامیابیوں نے قدم چومے' کبھی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ نظریاتی (ideological) میدان میں یقینی کامیابی کے ہمراہ' بدلتے زمانوں کے لحاظ سے سینکڑوں تدابیر (techniques) سے لبریز' اخلاص و فداکاری کے ہزارہا جلووں سے مزین اور اسلامی تعلیمات میں ڈھلے انسانوں کی عظمت کے مظاہر سے بھرپور دور تھا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام (وفات ۱۴۸ ہجری) کی زندگی سے بہتر انداز میں شناسائی کے لیے' حیاتِ ائمہؑ کے چوتھے دور کے آغاز ہی سے کچھ تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے۔

یہ دور محرم ۶۱ ہجری میں امام حسین ابن علیؑ کی شہادت کے بعد اور امام علی ابن الحسینؑ کی امامت کے آغاز سے شروع ہوا۔ جیسا کہ اشارہ کیا گیا' اس دور میں ائمہؑ اہلِ بیتؑ اپنی پیہم کوشش اور جدوجہد کے ذریعے سے چاہتے تھے کہ آئیڈیالوجی (ideology) کے میدان میں اپنی سرگرمیوں سے' مفاد پرست طاقتور حلقوں اور جاہل اذہان کے توسط سے اسلامی آئیڈیالوجی کے بنیادی خطوط میں پیدا کیے جانے والے انحرافات کے خلاف جنگ کے ساتھ ساتھ اسلامی حکومت وجود میں لانے' اسلامی آئیڈیالوجی کو جامۂ عمل پہنانے' قرآنِ کریم اور سنتِ پیغمبرؐ کے احیا اور علوی نظام کے قیام کے لیے ایک مسلسل اور طویل مدتی عمل کا آغاز اور

اس کی پیروی کریں۔

آمادگی پیدا کرنے کی ضرورت

واضح ہے کہ اس قسم کے انقلابی اور گہرے پروگرام کے لیے' اور وہ بھی ایک ایسے زوال پذیر معاشرے میں جس کی ذہنیت اور عملی زندگی کو تباہ و برباد کرنے' انحراف اور گمراہی میں مبتلا کرنے کے لیے برسہا برس کام کیا گیا تھا' گہری تدابیر (techniques) اور بنیادی تیاریاں لازم ہیں۔ وہ لوگ جو معاویہ کے زمانہ میں اور اُس سے پہلے کے ادوار میں ہزارہا حیلوں بہانوں اور ہزاروں طریقوں سے اپنی اسلامی طبیعت کو ترک کر چکے تھے یا وہ اسی طبیعت سے یکسر آشنا ہی نہ تھے۔ ایسے لوگ جو اسلامی سوچ اور انسانی صفت رکھنے والے قائدین اور حکمرانوں سے محرومی کی بنا پر' خرافاتی خیالات اور پست محرکات کے گندے گڑھے میں ڈوب چکے تھے اور اسلام کی حقیقت سے کہیں دور رہ گئے تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے امام حسنؑ کے ساتھ تعاون نہ کیا اور امام حسین ابن علیؑ کی مدد کے لیے نہیں نکلے۔

مختصر یہ کہ وہ لوگ جو بنی امیہ کی سخت گیری اور اس کی دہشت کی بنا پر بڑے کاموں کے لیے اقدام کرنے کی جرأت اور شجاعت سے محروم ہو چکے تھے۔۔۔ انہیں ایک ایسی تعمیری اور تبدیل کر دینے والی تربیت کے تحت آنا چاہیے تھا جو ان کی شخصیت اور سوچ کو اعلیٰ اخلاق کے لحاظ سے ایک سو اسی (۱۸۰) ڈگری پر پلٹا دے اور ان میں صالح انسان تیار کرے' ایسے انسان جو احیائے اسلام کا بارگراں اپنے کاندھوں پر اٹھا سکیں' ایسی انقلابی ذمہ داری کا بوجھ جیسا انقلاب پیغمبر اسلامؐ اپنے زمانے کے جاہل معاشرے میں لے کر آئے اور ایک ایسے معاشرے کے نظم و نسق کی ذمے داری جو ایسے انقلاب کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔۔۔۔

انقلاب کی تجدید: انقلاب برپا کرنے سے زیادہ مشکل ہے

ایک انقلاب کی تجدید کبھی کبھی اسے برپا کرنے سے زیادہ اہم اور دشوار ہو جاتی ہے۔

مضبوط حوصلے، راسخ ایمان، طاقتور اذہان، بیدار، آگاہ اور فعال فکروں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس تھکا دینے والے بوجھ کو ایک دراز مدت تک اپنے کاندھوں پر اٹھا سکیں۔ اب کون اس کام لیے تیار ہے؟ کیا وہ شیعہ جو امام حسین ابن علیؑ کے قیام کا بوجھ نہیں اٹھا پایا؟ کیا ایسا شیعہ جو امام حسنؑ کے ساتھ ہم قدم نہ ہوا؟؟

بے شک ہر ایسا قیام اور اقدام جو ناپختہ اور غیر تربیت یافتہ اور اسی قبیل کے عناصر کے بھروسے پر واقع ہوا ہو، اس کا انجام ندامت اور خسارت ہوتا ہے۔ توابین کا تجربہ اور اس کے بعد مختار اور ابراہیم ابن مالک کا قیام اس ادعا پر صداقت کی گواہی ہیں۔

امام سجادؑ ایک دوراہے پر

اب حادثۂ عاشورا کے بعد امام علی ابن حسینؑ ایک دوراہے پر ہیں یا تو ہیجان اور جذبات بھڑکا کر ایک مہم جوئی (کہ آپؑ جیسا شخص باآسانی اس بات پر قادر ہے کہ اپنے معتقدین اور چاہنے والوں کے درمیان اسے وجود میں لے آئے) اور جسارت آمیز عمل انجام دیں، پرچم مخالفت بلند کریں، ایک تہلکہ خیز واقعہ رونما کریں لیکن ایک گہرے اور دیرپا اقدام کے لیے ضروری وسائل فراہم نہ ہونے کی بنا پر جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں اور فکر و سیاست کے میدان کو بنوامیہ کی لوٹ مار کے لیے کھلا چھوڑ دیں۔۔۔۔ یا انہیں چاہیے کہ سطحی جذبات و احساسات کو پختہ اور سنجیدہ تدبیر کے ذریعے کنٹرول کریں اور سب سے پہلے اپنے عظیم کام کے لیے ضروری مقدمات فراہم کریں۔ اپنے بنیادی کام، اسلام کی حیات اور اسلامی معاشرے و نظام کی تشکیل نو کے آغاز کے لیے ایک رہنما فکر، صالح عناصر کا بندوبست کریں۔

فی الحال اپنی اور اپنے گنے چنے قابل بھروسہ اصحاب کی جانوں کی حفاظت کریں اور میدان کو حریفوں کے لیے خالی نہ چھوڑیں۔ جب تک زندہ ہیں اور جب تک بنوامیہ کے حکمرانوں کی متلاشی اور ہراساں آنکھوں سے پنہاں ہیں اس محاذ (صالح افراد کی تیاری اور ایک رہنما فکر کی تعلیم کا محاذ) کے اندر ایک مسلسل لیکن خفیہ جدوجہد میں مشغول رہیں اور پھر اس راہ کو جاری رکھنے کا کام

جو کہ بے شک منزلِ مقصود سے بہت زیادہ نزدیک ہے' اپنے بعد والے امامؑ کے سپرد کردیں۔

ایک دشوار تر راہ کا انتخاب

اب امامؑ ان دو راستوں میں سے کس راہ کا انتخاب کریں؟ اس میں شک نہیں کہ پہلا راستہ جاںنثاروں کا راستہ ہے لیکن ایک نظریاتی رہنما' جس کے عمل کی تاثیر کا دائرہ نہ صرف اس کے اپنے زمانے تک محدود ہوتا ہے بلکہ یہ دائرہ پوری تاریخ کا احاطہ کرتا ہے' اس کے لیے محض فداکاری اور جاںنثاری کافی نہیں' بلکہ اس کے علاوہ اسے گہری نظر کا مالک' دُور اندیش' بلند حوصلہ اور انتہائی مدبر بھی ہونا چاہیے۔ یہ وہ تمام حالات ہیں جنھوں نے امامؑ کے لیے دوسرے راستے کو حتمی اور قطعی بنایا اور امام علی ابن الحسینؑ نے دوسرے راستے کا جو انتہائی دشوار' حوصلے کا متقاضی اور زیادہ انقلابی تھا' اس کو منتخب کیا اور بالآخر اسی پر رہتے ہوئے (۹۵ ہجری میں) اپنی جان' جانِ آفرین کے سپرد کردی۔

امام سجادؑ کا تعمیری کردار

بعد میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی ایک حدیث میں امام چہارمؑ کے حالات و صورتحال اور ان کے تعمیری کردار کی ان الفاظ میں تصویر کشی کی ہے:

"اِرْتَدَّ النَّاسُ بَعْدَ الْحُسَیْنِ اِلَّا ثَلَاثَۃٌ: اَبُوْ خَالِدٍ الْکَابُلِیُّ وَ یَحْیَی ابْنُ اُمِّ الطَّوِیْلِ وَ جُبَیْرُ بْنُ مُطْعِمٍ ثُمَّ اَنَّ النَّاسَ لَحِقُوْا وَ کَثُرُوْا وَ کَانَ یَحْیَی بْنُ اُمِّ الطَّوِیْلِ یَدْخُلُ مَسْجِدَ الرَّسُوْلِ اللّٰہِ وَ یَقُوْلُ: کَفَرْنَا بِکُمْ وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ وَ الْبَغْضَاءُ۔"(۱)

"حسین ابن علیؑ کے بعد سب منحرف ہوگئے سوائے ان تین افراد کے ابو خالد کابلی' یحیٰی

۱۔ بحار الانوار ج ۴۶۔ ص ۱۴۴۔ ایک اور روایت میں ان تین افراد میں جابر بن عبداللہ انصاریؓ کے نام کا بھی اضافہ ہوا ہے اور پھر ایک دوسری روایت میں جابر ابن عبداللہ انصاریؓ کے بجائے سعید بن مسیب مخزومی اور جبیر بن مطعم کے بجائے حکیم بن جبیر کا نام آیا ہے۔ (بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۴۴) اور (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ابن ام الطویل اور جبیر ابن معطم (۲) اس کے بعد دوسرے لوگ اُن سے آ ملے اور شیعوں کی جمعیت بہت بڑھ گئی۔ یحییٰ ابن ام الطویل مسجد نبوی میں تشریف لاتے اور لوگوں کو خطاب کر کے فرماتے: ہم تمہارے (تمہاری راہ و روش سے) منکر ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان دشمنی، بغض وعداوت ہے۔"

کیسی حیرت انگیز حقیقت ہے!۔۔۔ واقعہ عاشورا کے بعد سب چلے گئے! سب ہی پھر گئے! سب ہی ایک پُرکشش اور آسودہ مستقبل کی طرف سے جو انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا' مایوس ہو گئے! ان لوگوں نے تشیع کے تمام مقاصد اور ارمانوں اور آرزوؤں سے صَرفِ نظر کر لیا' صرف نام کے شیعہ ہونے پر اور اس بات پر کہ اپنے دل میں اماموں سے عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اکتفا کر لیا۔۔۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کے شیعہ تاریخ میں ہمیشہ موجود رہے ہیں اور اس وقت بھی شیعوں کی بڑی اکثریت ایسی ہی ہے۔

امام سجادؑ کے زمانے میں ہزاروں شیعوں میں سے فقط تین شیعہ راستے پر رہے' فقط تین افراد نے امامؑ کی راہ سے اپنی وفاداری کو محفوظ رکھا' صرف یہ تین افراد تھے جو بنوامیہ کی حکومت کا حقیقی اور درندہ صفت چہرہ (جو ہمیشہ دین داری کے نقاب کے پیچھے پوشیدہ رہا) دیکھنے کے باوجود وحشت زدہ نہ ہوئے' حواس باختہ نہ ہوئے' انہوں نے اپنی توقعات کے خلاف کوئی چیز محسوس نہ کی اور اسی فولادی عزم کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہے۔۔۔

نظریاتی پختگی

یحییٰ ابن ام الطویل مسجد نبویؐ میں داخل ہوتے' مسلمانوں اور امام کے معتقد مجمع کے

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) مزید ایک روایت میں ان سب کے ساتھ سعید بن جبیر کے نام کا اضافہ ہوا ہے اور جبیر بن معطم کی بجائے محمد بن جبیر بن معطم کا ذکر کیا گیا ہے۔ (رجال کشی۔ ص ۱۱۵)

۲۔ علم رجال کے معاصر عالم محقق شوشتری کی نظر میں اس حدیث میں "جبیر بن معطم"۔۔۔۔ حکیم بن جبیر بن معطم" کا تحریف شدہ ہے۔ (قاموس الرجال۔ ج ۹۔ ۳۹۹)

درمیان کھڑے ہوتے اور شیعیت کے دعویدار ان افراد سے خطاب کر کے حضرت ابراہیمؑ بت شکن کے وہ الفاظ دہراتے جو آپؑ اپنے زمانے کے بت پرستوں سے کہا کرتے تھے۔

"اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ۔"

"جب انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے معبودوں سے بیزار ہیں۔ ہم نے تمہارا انکار کر دیا ہے اور ہمارے تمہارے درمیان بغض اور عداوت بالکل واضح ہے یہاں تک کہ تم خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان لے آؤ"(۱)

یہ وہ کلام ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے حلقہ بگوش افراد اپنے زمانے کے معارضین کے سامنے بیان کیا کرتے تھے' اور قرآن کریم اسے ان کی زبان سے نقل کرتا ہے۔ یہ وہی نظریاتی قطعیت اور ایک انقلابی مکتب کے پیروکار اور وابستہ افراد کی صف بندی ہے ان لوگوں کے خلاف جو اپنی پست اور حقیر مادی آرزوؤں سے دل بستگی اور پابندی کی بنا پر اپنے نبیؐ کے پیغام کو قبول نہیں کرتے اور اُس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' یہ وہی چیز ہے جو تمام انبیاؑ کو اپنی دعوت کے ابتدائی ایام میں پیش آتی تھی۔ انبیاؑ اپنے دین کے لیے بلند کردہ اوّلین نعروں میں اس گمراہ کن وحدت اور یک جہتی کو جو ان کے زمانے کے لوگوں میں پہلے سے موجود تھی درہم برہم کر دیتے تھے۔

اس بدعاقبت کاروان' جو لوگوں کو ذلیل کرنے والے قائدین کے پرچم تلے تباہی اور نابودی کی گھاٹی کی طرف رواں دواں ہوتا تھا' کے درمیان سے کچھ لوگوں کو باہر نکال لیتے تھے۔ کم از کم ایک گروہ کو اس تلخ مستقبل سے نجات دلا دیتے تھے۔۔۔۔ اور اپنے زمانے کے باطل اور یک جہت متحدہ محاذ میں اختلاف ڈال دیتے تھے۔ ایسے افراد جو بے خبر بھیڑوں کی طرح سر

۱۔ سورۂ ممتحنہ ۶۰۔ آیت ۴

جھکائے راستہ چل رہے ہوتے تھے' ان کے سامنے آواز بلند کرتے تھے' شور مچاتے تھے' ان کو ہوشیار کرتے تھے' گمراہ کن سیلاب کے سامنے بند باندھتے تھے۔ البتہ ایک گروہ نبی کی بات نہیں سنتا اور جس راہ کی جانب وہ بلا رہا ہوتا تھا' اس سے منہ پھیر لیتا اور معنوی و مادی سکوت و زوال کی کھائی کی طرف بڑھتا رہتا تھا۔

مقابل محاذ کے خلاف انبیاؑ کی صف بندی

پس انبیاؑ اپنے اقدام' اپنی دعوت اور اپنی طرف سے ایک مبارزہ شروع کر کے ان لوگوں کے درمیان ایک ناگزیر صف بندی اور محاذ بنا دیتے تھے' جو اپنے سابقہ حق پذیر کردار یا اپنی طبقاتی اور اجتماعی تعلق کی بنا پر ان سے اور ان کے مکتب اور ان کی اختیار کردہ راہ کے معتقد ہو جاتے تھے یا پھر ہوا و ہوس کی پیروی اور حقیر آرزوؤں سے دل بستگی اور اسی موجودہ ذلت آمیز زندگی پر اکتفا کر کے انبیاؑ سے منہ پھیر لیتے تھے یا ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور یہ وہ ناگزیر صف بندیاں کہ جن کو امیرالمومنینؑ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

"مَنْ لَمْ یَکُنْ مَعَنَا کَانَ عَلَیْنَا"(۱)

"جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا مخالف ہے۔"

یعنی اس میدان میں کوئی درمیانی راہ اور امن و سلامتی کا علاقہ موجود نہیں۔۔۔۔۔ جو کوئی بھی توحید کی صف سے جدا ہوا (چاہے اپنے خیال میں وہ درمیان میں ہو) وہ طاغوت کی صف سے ملحق ہے۔ یعنی اس مقام پر غیر جانبداری ایک بے معنی لفظ ہے۔ یہ وہی صدا ہے جو (امام سجادؑ کے حقیقی شیعہ اور ان کے ساتھی اور محرم اسرار) یحییٰ ابن ام الطویل اپنے زمانے کے ان نام نہاد شیعوں کے سامنے بلند کرتے تھے جو تشیع اور ولایت کے نام سے دل خوش کر کے خودخواہی اور مفاد پرستی کے گڑھے میں ڈوبے ہوئے تھے اور جنہوں نے تشیع اور ولی اللہ کی ولایت کے تمام اعلیٰ

۱۔ بشارۃ المصطفیٰ۔ ص ۲۶

مقاصد کو بھلا دیا تھا۔

''ہم تم سے منہ پھیر چکے ہیں اور تم سے بیزار ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان بغض و کینہ و عداوت پائی جاتی ہے۔''

صالح عناصر کا امامؑ سے ملحق ہو جانا

جس دن شیعوں کے کھوکھلے دعووں کی بجائے اس کی جگہ حقیقی ولایت (یعنی شیعوں کی امامؑ کے ساتھ یک جہتی اور وابستگی) لے لے اور شیعہ فکر و عمل کے لحاظ سے اور قلبی طور پر اپنے امامؑ سے ایسا اٹوٹ اتصال پیدا کر لیں کہ انہیں تلوار کے ذریعے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ کیا جا سکے' تو یحییٰ ابن ام الطویل بھی تشیع کے ایک حصہ کے طور پر ان کے ساتھ اور ان ہی میں سے ہوگا اور یہ دشمنی و جدائی برادری و قربت میں بدل جائے گی اور ہوا بھی ایسا ہی۔ امامؑ اور ان کے گنتی کے اصحاب کی مسلسل کوششوں اور جدوجہد کی وجہ سے (جن کا ایک نمونہ ہم یحییٰ ابن ام الطویل کے بارے میں دیکھتے ہیں)۔ (۱)

۱۔ امام سجادؑ کے اصحاب کی روش کا ایک دوسرا نمونہ جو اسی عظیم شیعہ کے بارے میں ایک حدیث میں اس طرح سے آیا ہے: میں نے یحییٰ ابن ام الطویل کو دیکھا کہ وہ کناسہ (شہر کوفہ کا ایک محلہ) میں کھڑے ہیں اور بلند آواز سے پکار رہے ہیں: اے دوستانِ خدا کے گروہ! ہم اس چیز سے بیزار ہیں جسے تم سن رہے ہو' جو کوئی علیؑ پر لعنت کرے' اس پر خدا کی لعنت ہو۔ ہم مروانیوں اور جسے وہ خدا کی جگہ پوجتے ہیں' اس سے بیزار ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی آواز کو دھیما کرتے ہیں' گویا ایک حکم کے طور پر اپنے قریبی ساتھیوں سے فرماتے ہیں: ایسے لوگوں کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھو جو اولیائے خدا کو برا بھلا کہتے ہیں' ایسے لوگوں سے' جن میں ہماری راہ کے بارے میں شک پایا جاتا ہے' کنارہ کش ہو جاؤ۔ جو کوئی کسی حاجت میں تمہارا محتاج رہ جائے تم نے اس سے خیانت کی ہے۔ اس کے بعد اس آیت کی تلاوت فرماتے ہیں: "اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ ---" (ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ کا انتظام کیا ہے جس کے شعلوں اور دھوئیں نے خیمے کی طرح انہیں اپنے احاطے میں لے لیا ہے۔ سورۂ کہف۔ آیت ۲۹) قاموس الرجال۔ ج ۹۔ ص ۳۹۹۔

صالح اور لائق عناصر اور ایسے افراد جو اس دشوار ذمے داری کا بوجھ اٹھانے کی قابلیت رکھتے تھے بتدریج امامؑ اور شیعوں کے اس مختصر گروہ کے ساتھ آملے' جس کے بارے میں مذکورہ حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے نقل کیا گیا کہ "ثُمَّ اَنَّ النَّاسَ لَحِقُوْا وَ کَثُرُوْا" اس کے بعد کچھ دوسرے لوگ ان سے آملے اور شیعوں کی جمعیت میں اضافہ ہوگیا۔ اس طرح امام سجادؑ کے کام کا آغاز ہوا اور (جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا) امامؑ کا یہی طرز عمل اور کچھ دوسرے موقف (جس کے ایک حصے کی جانب ہم مختصراً اشارہ کریں گے) ان کی اور ان کے بعض نزدیک ترین اصحاب کی شہادت کی قیمت پر تمام ہوا۔ البتہ ہم نے امامؑ چہارم کی زندگی میں حکمرانوں اور حکومت کے خلاف کسی صریح تعارض کی علامت نہیں دیکھی۔ مدبرانہ انداز کار اسی بات کا تقاضا کرتا تھا۔

امامؑ کا شعورانہ طرزِ عمل

اگر تند و تیز اور طعن سے بھری اور حکومت و خلافت کے استحقاق کے دعوؤں سے لبریز گفتگو (جن کے نمونے ہم امام موسیٰ ابن جعفرؑ اور بعض دوسرے ائمہؑ کے حالات میں اپنے زمانے کے خلفا کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں) بنو امیہ کے مقتدر ترین خلیفہ عبدالملک بن مروان اور امام سجادؑ کے درمیان ہوئی ہوتی تو بلاشبہ امامؑ اپنی خاص ذمے داری کی انجام دہی میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی شہید ہو جاتے اور اپنی تازہ بنی ہوئی تنظیم کو ختم کر بیٹھتے۔ اور یہ کسی نظریاتی اور الٰہی رہبر سے جو اپنے مکتب اور فکر کی پیش رفت کے سوا کچھ اور نہیں سوچتا اور ذاتی طور پر حکومت حاصل کرنے کی اسے مطلقاً جلدی نہیں ہوتی' کسی صورت منطقی اور قابل قبول نہیں تھا۔

مقتدر قوتوں کے خلاف امامؑ کا حقیقی موقف

کسی نادر موقع پر اپنے زمانے کی مقتدر قوتوں کے خلاف امامؑ کے حقیقی موقف کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ امامؑ کو ان کے ساتھ کھلم کھلا مقابلے پر لے آئے بلکہ صرف اس حد تک کہ تاریخ کو اور ایک حد تک اپنے نزدیکی ماحول کو اپنے عمل اور حرکت سے واقف رکھ سکے۔

اس قسم کے نمونوں میں سے ایک، وہ مذمتی اور انتہائی جھنجوڑ دینے والا خط ہے جو امامؑ نے بنی امیہ کی حکومتی مشینری سے وابستہ ایک دینی شخصیت "محمد ابن شہاب زہری" کے لیے تحریر کیا جس کے متعلق واقعاً یہ کہنا چاہیے کہ امامؑ نے اس خط کو تاریخ اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے تحریر کیا نہ کہ "محمد ابن شہاب" کے لیے۔ کیونکہ وہ ایسا شخص نہ تھا جو اپنی اس شدید وابستگی، نرم ولذیذ دسترخوان اور اس اثر ورسوخ اور شہرت سے جو اُسے اِس مشینری کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے حاصل تھی، صَرفِ نظر کرے اور ہم نے دیکھا کہ اس نے صَرفِ نظر نہیں کیا اور پوری زندگی ان کے ساتھ رہا حتیٰ کہ ان کے لیے کتاب بھی لکھی۔(۱) اور ان کے مفاد کی خاطر حدیث نقل کرتا اور گھڑتا بھی تھا۔(۲) پس یہ خط امام سجادؑ کی جانب سے ایک سند ہے جس میں آپؑ اپنے زمانے اور خود اپنی صورتِ حال کو اپنے زمانے کے مقابل بیان کرتے ہیں۔ اس خط کا متن کتاب شریف "تحف العقول" میں نقل ہوا ہے جس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک اور نمونہ وہ جواب ہے جو آپ نے عبدالملک کے خط کا دیا۔ اس میں عبدالملک نے آپؑ کو اپنی ایک آزاد کردہ کنیز کے ساتھ شادی کرلینے پر طعنہ دیا تھا اور اس طریقے سے چاہا تھا کہ حضرتؑ کو یہ بات سمجھا دے کہ وہ آپؑ کے تمام کاموں (حتیٰ کہ آپؑ کے داخلی اور ذاتی امور) سے بھی باخبر ہے اور اپنی رشتہ داری بھی آنحضرتؑ کو یاد دلا دے، جیسا کہ اس قسم کے لوگوں کا شیوہ ہوا کرتا ہے، بعض مواقع پر آپؑ کی دلجوئی کی راہ سے آپؑ کے قریب آئے۔ امامؑ نے اس کے جواب میں اس بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو بیان کرتے ہوئے کہ کسی کا مسلمان اور اہلِ ایمان

۱۔ "ہم سمجھتے تھے کہ ہم نے زہری سے بہت سی احادیث نقل کی ہیں، یہاں تک کہ ولید مارا گیا۔۔۔۔ ولید کے دربار کے خزانے سے بہت سے کاغذات چوپایوں پر لادے جاتے اور کہتے تھے کہ یہ زہری کا علم و دانش ہے۔"
(طبقات ابن سعد۔ ج ۲۔ ص ۱۳۵، ۱۳۶)

۲۔ رجوع کیجیے "اجوبۃ مسائل جار اللہ" سید شرف الدین عاملی۔ ص ۵۹، ۶۰۔ نیز دراسات فی الکافی و الصحیح۔ ص ۲۶۱)

ہونا دوسرے تمام امتیازات کو مٹا ڈالتا ہے' ایک مخفی طنز کے ساتھ اُسے اُس کے اجداد کی گزشتہ جاہلیت اور شاید خود اس کی موجودہ جاہلی صورت حال پر سرزنش فرمائی۔

"فَلَا لُوْمَ عَلَی امْرِءٍ مُسْلِمٍ اِنَّمَا اللُّوْمُ لُوْمُ الْجَاهِلِیَّةِ۔ وَالسَّلَامُ کوئی مسلمان کسی قسم کی پستی اور ذلت کا حامل نہیں' پستی تو بس جاہلیت کی ذلت ہے اور بس۔"

جب یہ خط اموی خلیفہ کے پاس پہنچا تو اس کا بیٹا سلیمان (اُس نے بھی اپنے باپ کی طرح امامؑ کی گفتار میں اس طنز اور سرزنش کو محسوس کر لیا تھا) بولا: انہوں نے تجھ پر ایک عجیب تفاخر کیا ہے اے امیر المومنین!۔ اور خلیفہ جو اپنے کند ذہن بیٹے سے زیادہ عقل مند اور شیعوں کے امامؑ کے ساتھ تنازع کے انجام سے اچھی طرح باخبر تھا بولا: ایسا نہ کہو بیٹا! یہ بنی ہاشم کی زبان ہے جو راستے کو چیرتی ہے۔(۱)

ایک اور نمونہ وہ ہے جو آپؑ نے عبد الملک بن مروان کے ایک تقاضے کے جواب میں دیا۔ عبد الملک نے سن رکھا تھا کہ امامؑ کے پاس پیغمبرِ اسلام کی تلوار ہے۔ اُس نے ایک شخص کو امامؑ کے پاس بھیجا اور تقاضا کیا کہ وہ یہ شمشیر اسے بخش دیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہلوا دیا کہ اگر امامؑ کو کوئی بھی امر اور کام اس سے ہو تو وہ اُس کی انجام دہی کے لیے حاضر ہے۔ امامؑ نے عبد الملک کو جواب دیا۔ خلیفہ نے حضرتؑ کے نام ایک اور خط لکھا اور آپؑ کو دھمکی دی کہ بیت المال سے ان کا حصہ بند کر دے گا۔ امامؑ نے اس کے جواب میں عبد الملک کو تحریر کیا:

"اما بعد۔ خداوندِ عالم نے اپنے ذمے لیا ہے کہ متقی بندوں کو' جو کچھ ان کے لیے ناگوار ہے' اس سے نجات بخشے گا اور جہاں سے انہیں گمان نہ ہوگا وہاں سے انہیں روزی فراہم کرے گا۔۔۔ اور قرآن نے فرمایا ہے کہ بے شک خداوندِ عالم کسی ناشکرے خائن کو پسند نہیں کرتا ۔۔۔ اب دیکھ لو ہم دونوں میں سے کون اس آیت سے مطابقت رکھتا ہے۔"(۲)

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۳۱۹ تا ۳۲۱' منقول از کافی۔ ج ۵۔ ص ۳۴۴

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۲۶۔ ص ۹۵

نرم اور خفیہ سرگرمی

ان نمونوں سے قطع نظر' مجموعی طور پر امام سجادؑ کی زندگی صالح افراد کی تیاری' اپنے پیروکاروں کے اذہان میں شیعی طرز فکر کو پختہ کرنے اور تحریفات کے خلاف جنگ کے لیے نرم اور خفیہ سرگرمیوں سے عبارت تھی۔ درحقیقت شیعی مقاصد (یعنی اسلامی نظام کو جامہ عمل پہنانا اور حکومت علوی کا قیام) کے لیے اوّلین قدم امام سجادؑ کے ذریعے اٹھایا گیا ہے۔ البتہ جیسا کہ اشارہ ہوا یہ بظاہر مصالحت آمیز روش کسی صورت بھی اس بات کا موجب نہ تھی کہ امامؑ اور ان کے اصحاب بنی امیہ کی حکومت کے مظالم اور عداوت سے ہمیشہ امان میں رہیں گے۔

امامؑ کے اصحاب میں سے کئی افراد انتہائی ظالمانہ طریقے سے قتل کیے گئے اور بہت سے جلاوطن اور اپنے شہروں سے دور اور زندانوں میں اسیر ہوئے۔ اور خود امامؑ کو کم از کم ایک مرتبہ انتہائی برے حال میں طوق و زنجیر میں جکڑ کر اور بہت سے سپاہیوں کے گھیرے میں مدینہ سے شام لے جایا گیا اور بارہا آپؑ کو مخالفین کی جانب سے رکاوٹوں' اذیتوں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر ۹۵ ہجری میں ولید بن عبدالملک (اموی خلیفہ) کے ہاتھوں آپؑ کو زہر دیا گیا اور آپؑ کی شہادت واقع ہوئی۔ (۱) خدا اور انسانوں کی جانب سے آپؑ پر بے انتہا درود وسلام۔

امام باقر علیہ السلام کے دور کی نمایاں خصوصیات

پانچویں امام' امام محمد باقر علیہ السلام کا دورِ حیات مکمل طور پر امام سجادؑ کی زندگی کا منطقی تسلسل ہے۔ اب ایک مرتبہ پھر کچھ لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور شیعہ دوبارہ اپنی شخصیت اور وجود کو محسوس کرتے ہیں۔ شیعی دعوت جو کربلا کے حادثے اور اس کے بعد رونما ہونے والے خونیں

۱۔ امام سجادؑ کی زندگی کے بارے میں گفتگو اور آپؑ کی مجاہدت' بھرپور جدوجہد اور آپؑ کے زمانے کے مختلف حوادث ائمہ شیعہ کی زندگی کا دلچسپ ترین اور عبرت انگیز ترین حصہ ہے۔ امید ہے اس موضوع پر ایک مستقل مقالہ لکھا جائے۔

حوادث (جیسا کہ حادثۂ حرہ اور حادثۂ توابین) اور خلفا کی سخت گیری کی بنا پر چند سال کے لیے متوقف ہو گئی تھی اور بہت سے ضخیم پردوں کے پیچھے اظہار کیے جانے کے سوا اسے پیش نہیں کیا جاتا تھا اب اسلامی ممالک کے بہت سے حصوں' خصوصاً عراق' حجاز اور خراسان میں جڑ پکڑ رہی تھی اور ایک وسیع حلقے کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ حتیٰ ایک محدود تر دائرے میں ایک فکری و عملی وابستگی کی صورت میں جسے ایک "جماعتی تنظیم" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے' ڈھل گئی تھی۔ وہ دن جب امام سجادؑ فرمایا کرتے تھے: "پورے حجاز میں ہمارے بیس (۲۰) ساتھی اور عقیدت مند بھی نہیں ہیں" (۱) گزر گیا تھا۔

اور اب جب امام محمد باقر علیہ السلام مدینہ میں مسجد نبویؐ میں داخل ہوتے تو خراسان اور دوسرے علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا ایک بڑا گروہ ان کے گرد گھیرا ڈال دیتا اور ان سے فقہی مسائل کے بارے میں سوال کرتا۔ طاؤس یمانی' قتادہ بن دعامہ اور ابوحنیفہ جیسے لوگ اور دوسرے افراد جو علمِ دین میں نامور شخصیات تھے لیکن شیعیت اور امامت کی صف میں ان کا شمار نہیں ہوتا تھا' امامؑ کے وسیع علم کی شہرت کو سنتے اور استفادے کی غرض سے' بحث و جدل کے لیے آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ کمیت اسدی جیسے فصیح و بلیغ اور ماہر شاعر کا اہم ترین فنی اثر "ہاشمیات" کے نام سے ایک قصیدہ ہے جو دست بدست اور زبان بزبان گردش کرتا ہے اور لوگوں کو آلِ محمدؐ کے حق' ان کے علم و دانش اور ان کے معنوی مقام سے آشنا کرتا ہے۔

دوسری طرف آلِ مروان سے تعلق رکھنے والے خلفا اس وجہ سے کہ عبدالملک بن مروان (متوفی ۸۶ ہجری) کے بیس سالہ دورِ اقتدار کے خاتمے اور اپنے تمام مخالفین کے سر کچلنے اور اپنی مخالفت کے تمام شعلوں کو ٹھنڈا کرنے کے بعد امن و سکون محسوس کر رہے تھے اور اس وجہ سے بھی کہ خلافت کی با آسانی ہاتھ آئی ہوئی متاع کی اپنے گزشتگان کی طرح قدر نہیں کر رہے تھے اور ان سرگرمیوں کی بنا پر بھی جو اس جاہ و جلال کا لازمہ ہے' انہوں نے تشیع کے کاموں سے کوئی خاص

۱۔ شرح النہج۔ ج ۴۔ ص ۱۰۴ اور بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۱۴۳

غرض نہ رکھی اور نتیجے کے طور پر امامؑ اور ان کے اصحاب ایک حد تک ان کے تعارضات سے امان میں رہے۔

جی ہاں! حالات چند پہلوؤں سے امامت اور تشیع کے حق میں بدل گئے تھے۔ پس قدرتی طور پر یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے دور امامت میں ایک قدم آگے بڑھایا اور شیعوں کی جدوجہد کو آخری قدم کی جانب اس کے اگلے مرحلے کی طرف لے گئے اور یہی چیز ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام کے دور کی ایک نمایاں خصوصیت بنی ہے۔

بامقصد دعوت کا پھیلاؤ

امام محمد باقر علیہ السلام کے انیس (۱۹) سالہ دور امامت (۹۵ سے ۱۱۴ ہجری تک) کو ایک مختصر مطالعے میں اس طرح خلاصہ کیا جاسکتا ہے کہ آپؑ کے والد امام سجادؑ نے اپنی عمر کے آخری لمحات میں انہیں شیعوں کا پیشوا اور اپنا جانشین منتخب کیا اور اس منصب کی ان کے لیے اپنے دوسرے بیٹوں اور وابستہ افراد کے سامنے تصدیق وتائید کی۔ ایک صندوق جو روایت کی زبان میں علم ودانش سے پُر (۱) یا رسول اللہؐ کے ہتھیار سے بھرا ہوا تھا' کی نشاندہی فرمائی اور فرمایا: "اے محمد! اس صندوق کو اپنے گھر لے جاؤ"۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا: "اس صندوق میں درہم ودینار میں سے کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ علم سے بھرا ہوا ہے۔" (۲) گویا اس طرح سے اور اس زبان میں حاضرین کے سامنے علمی اور فکری رہبری (علم ودانش) اور انقلابی قیادت (پیغمبرؐ کے ہتھیار) کی میراث پانے والے کا تعارف کروایا۔

امامؑ اور ان کے سچے اصحاب کی ابتدائی لمحات سے ہی وسیع اور ہمہ جانبہ کوشش سے ایک بامقصد اور زیروزبر کرنے والی شیعی دعوت نئے افق پر طلوع ہوئی۔ اس دعوت کا دامن اس قدر وسیع تھا کہ شیعہ نشین علاقوں (مدینہ اور کوفہ) کے علاوہ جدید علاقے بالخصوص اسلامی مملکت کے وہ

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۲۲۹

۲۔ حوالہ سابق

حصے جو بنی امیہ کے مرکز سے دور تھے وہاں بھی شیعی طرز تفکر کی عملداری میں اضافہ ہوا۔ خراسان کا اس میں سب سے زیادہ نام لیا جاسکتا ہے، جس کے لوگوں میں شیعی تبلیغات کے نفوذ کا متعدد روایات میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔(۱)

افسوس ناک سماجی وذہنی حقیقت

اس سخت اور شدید ترین جدوجہد کے دوران امامؑ اور ان کے ساتھیوں کو جو چیز مسلسل حرکت پر ابھارتی اور انہیں ہر لمحہ اپنے الٰہی فریضے کی انجام دہی کی جانب پکارتی تھی، وہ معاشرے کی افسوس ناک سماجی وذہنی حقیقت ہے۔ یہ حضرات اپنے سامنے ایسے لوگوں کا مشاہدہ کررہے تھے جو ایک طرف تو بری اور تباہ کن تربیت کے زیر اثر روز بروز عام معاشرے میں جاری برائیوں کے گڑھے میں غرق ہورہے تھے اور رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک جاپہنچا تھا کہ عام افراد بھی اپنے حکمرانوں اور قائدین کی طرح امامت کی نجات بخش دعوت کی جانب کان نہیں دھر رہے تھے۔

"اِنۡ دَعَوۡنَاهُمۡ لَمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَنَا۔"(۲)

"اگر ہم انہیں پکارتے ہیں تو وہ ہماری دعوت قبول نہیں کرتے"

اور دوسری طرف اس انحرافی صورت حال میں کہ جہاں تمام چیزیں حتیٰ کہ درس وبحث، فقہ وکلام، حدیث وتفسیر بھی اموی طاغوتوں کی خواہشات اور تمناؤں کے تحت کی جارہی تھیں، امید کا کوئی دریچہ بھی ان کے سامنے کھلا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا اور اگر تشیع بھی ان کی دعوت اور ہدایت کے لیے کمر نہ کسے تو راہِ ہدایت ان پر یکسر بند ہوجائے: "وَاِنۡ تَرَكۡنَاهُمۡ لَمۡ يَهۡتَدُوۡا

۱۔ان ہی میں سے ایک ابوحمزہ ثمالی کی روایت "حَتّٰى اَقْبَلَ اَبُوْ جَعْفَرٍ وَحَوْلَهٗ اَهْلُ خُرَاسَانَ وَغَيْرُهُمْ يَسْئَلُوْنَهٗ عَنْ مَنَاسِكِ الْحَجِّ. (بحارالانوار۔ ج ۴۶۔ص ۳۵۷) اور وہ روایت جو خراسان کے ایک عالم کی عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ ایک عبرت انگیز اور سخت گفتگو کا احوال نقل کرتی ہے۔ (رجوع کیجیے: بحارالانوار۔ ج ۴۶۔ص ۳۳۶

۲۔بحارالانوار۔ج ۴۶۔ص ۲۸۸

یغنیوکا"(۱) اور اگر ہم انہیں چھوڑ دیں تو کسی اور ذریعے سے ان کی ہدایت نہیں ہو سکتی"۔

امامؑ کا شدید موقف

اس پیچیدہ اجتماعی صورت حال کا گہرا ادراک ہونے کی بنیاد پر امامؑ نے نظریاتی اور ثقافتی طاقتوں یعنی بکے ہوئے درباری شعرا اور علما (جو معاشرے کی اس غیر سالم فکر کو بنانے والے تھے) کے خلاف اپنے شدید موقف کا اظہار کیا اور ان پر اپنی تنقید کے تازیانے برسا کر ان کے سوئے ہوئے ضمیروں پر نہ سہی ان کے بے خبر پیروکاروں کے اذہان میں انتباہ اور بیداری کی ایک لہر پیدا کر دی۔ آپؑ نے ایک شاعر "کثیر" پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا:

تم نے عبد الملک کی تعریف کی ہے؟!

اور وہ [شاعر] لاابالی پن یا سادہ لوحی کے ساتھ اپنے گناہ کی توجیہ پر اتر آتا ہے اور جواب دیتا ہے:

میں نے اسے رہنمائے ہدایت کہہ کر مخاطب نہیں کیا بلکہ اسے شیر' سورج' دریا' اژدھا اور پہاڑ کہا ہے اور شیر ایک کتا ہے اور سورج ایک جامد جسم اور دریا ایک بے جان پیکر اور اژدھا ایک بدبودار کیڑا اور پہاڑ ایک سخت پتھر ہے۔۔۔

اور امامؑ اس ناقابل قبول توجیہ پر معنی خیز انداز میں مسکرا دیتے ہیں اور اس موقع پر (انقلابی اور باہدف شاعر) "کمیت" اٹھتا ہے اور اپنے قصائد ہاشمی میں سے ایک قصیدہ پیش کرتا ہے۔(۲) اور ان دو فنی کاموں کا موازنہ وہاں موجود لوگوں کے اذہان اور وہ تمام لوگ جن

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۳۶۔ ص ۲۸۸

۲۔ وہ قصیدہ جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے

مَنْ لِقَلْبٍ مُتَیَّمٍ مُسْتَهَامٍ غَیْرِ مَا صَبْوَةٍ وَلَا أَحْلَامٍ

اور جو اس پُر معنی اور جھنجوڑ دینے والے اور معرفت سے بھرپور شعر تک آتا ہے

سَاسَةٌ لَا کَمَنْ یَرْعَی النَّا سَ سَوَاءً وَرَعْیَةِ الْأَنْعَامِ

کے کانوں تک یہ ماجرا پہنچا اور پہنچے گا ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔(۱)

مواقع سے استفادہ

ابن عباس کے معروف شاگرد عکرمہ جنہیں لوگوں کے درمیان عظیم اعتبار اور حیثیت حاصل تھی' وہ امامؑ سے ملاقات کی غرض سے جاتے ہیں اور امامؑ کے وقار و معنویت اور آپؑ کی علمی و روحانی شخصیت کے اثر میں ایسے آتے ہیں کہ بے اختیار امامؑ کی آغوش میں گر پڑتے ہیں اور تعجب کے ساتھ اپنے آپ سے کہتے ہیں:

''میں ابن عباس جیسے بزرگوں کے ساتھ رہا ہوں اور مجھ پر کبھی اس قسم کی حالت طاری نہیں ہوئی ہے۔

جواب میں امامؑ فرماتے ہیں:'' وَيْلَكَ يَا عُبَيْدَ أَهْلِ الشَّامِ أَنَّكَ بَيْنَ يَدَيْ بُيُوتٍ أَذِنَ اللهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ۔''

اے شامیوں کے حقیر غلام' وائے ہو تجھ پر! تو اس وقت ایسے گھروں کے سامنے کھڑا ہے جنہیں اذنِ الٰہی سے رفعت ملی ہے اور جو ذکرِ الٰہی کا مرکز ہیں۔''(۲)

امامؑ ہر مناسب موقعے پر شیعوں کی زندگی کے کسی تلخ گوشے کی نشاندہی کرتے ہوئے اور خود اپنے اور اپنے اصحاب پر مسلط طاقتوں کی جانب سے شدید دباؤ کی تشریح فرماتے ہوئے غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کے جذبات و احساسات کو متحرک کرتے اور ان کے مردہ اور سرد خون کو جوش دلاتے ہیں اور ان کے بے جان دلوں کو ہیجان عطا کرتے ہیں۔۔۔ یعنی انہیں تند و تیز رجحانات اور انقلابی موقف اپنانے پر آمادہ کرتے ہیں۔

فرعونی معاشرے میں بنی اسرائیل کی داستان

ایک شخص جو آپؑ سے سوال کرتا ہے کہ'' اے فرزندِ رسولؐ! آپؑ صبح کیسے کرتے ہیں!!

۱۔ مناقب شہرآشوب۔ ج ۳۔ ص ۲۰۷

۲۔ بحارالانوار۔ ج ۳۶۔ ص ۲۵۸

تو آپؑ اس سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

"کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ تم سمجھ سکو کہ ہم کیسے ہیں اور کس طرح صبح کرتے ہیں؟ ہماری داستان فرعونی معاشرے میں بنی اسرائیل کی داستان کی طرح ہے کہ ان کے بیٹوں کو وہ مار ڈالتے تھے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔ جان لو کہ یہ "بنی امیہ" ہمارے بیٹوں کو مار ڈالتے ہیں اور ہماری عورتوں کو زندہ رکھتے ہیں۔۔۔"

اس پُر معنی اور ابھارنے والے بیان کے بعد اصل مسئلے (یعنی) شیعی دعوت اور حکومتِ اہلِ بیتؑ کی اولویت کو سامنے لاتے ہیں:

"عرب سمجھتے تھے کہ وہ عجم سے برتر ہیں کیونکہ محمدؐ عرب سے تعلق رکھتے ہیں اور عجم اس خیال کے سامنے گردن جھکا دیتے تھے۔ قریش یہ سمجھتے تھے کہ انہیں دوسرے عرب قبائل پر برتری حاصل ہے کیونکہ محمدؐ کا تعلق قریش سے ہے اور ان لوگوں نے اس خیال کے سامنے سر جھکا دیا۔۔۔ اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو ہمیں قریش کے دوسرے گھرانوں پر برتری حاصل ہے کیونکہ ہم محمدؐ کے فرزند اور ان کے خاندان سے ہیں اس نسبت میں کوئی بھی ہمارا شریک نہیں۔"

وہ شخص گویا انتہائی ہیجان میں آ گیا تھا' وہ کہتا ہے:

"باخدا ہم آپؑ کے گھرانے سے محبت کرتے ہیں۔۔۔۔

اور امامؑ جو اسے مکمل فکری' قلبی اور عملی ہم آہنگی (ولایت) تک لے آئے تھے اس سے انتہائی آگاہی بخش اور ہوشیار کر دینے والا کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"پس اپنے آپ کو بلاؤں کے لیے تیار کر لو۔ خدا کی قسم! بلا ہمارے شیعوں کے لیے پہاڑ کے دامن سے اترنے والے سیلاب سے بھی زیادہ قریب ہوا کرتی ہے۔ بلا سب سے پہلے ہم پر آتی ہے اور اس کے بعد تم پر اسی طرح جیسے کہ امن وسکون کی راحت پہلے ہم تک پہنچتی ہے اور اس کے بعد تم تک۔"(۱)

۱۔ بحارالانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۳۰۷

زندہ جسم کا مفکر ذہن

ایک محدود اور نسبتاً زیادہ قابل اطمینان دائرے میں شیعوں کے ساتھ امامؑ کے روابط دوسری خصوصیات کے حامل تھے۔ ان تعلقات میں ہم امام کا مشاہدہ ایک زندہ جسم میں مفکر ذہن کے طور پر کرتے ہیں جو اعضاو جوارح اور دھڑکتے ہوئے دل کے ذریعے بدن کو غذا فراہم کرتا ہے۔

وہ باتیں جو امامؑ کے اس گروہ کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے ہماری دسترس میں ہیں' ایک طرف تو ان سے فکری تعلیم وتربیت کے میدان میں صراحت کی نشاندہی ہوتی ہے اور دوسری طرف ان کے اور امامؑ کے درمیان ایک ہم آہنگی اور نپے تلے تنظیمی تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔

رازداری کا سبب

امامؑ کے نزدیک ترین رازدار صحابی فضیل بن یسار(۱) مراسم حج میں امامؑ کے ساتھ تھے۔ امامؑ کعبہ کے گرد طواف کرنے والے حاجیوں کو دیکھتے ہیں اور فرماتے ہیں:

''زمانۂ جاہلیت میں بھی [لوگ] اسی طرح چکر لگاتے تھے۔ حکم یہ ہے کہ ہماری طرف آئیں اور ہم سے اپنی دوستی اور وابستگی کا اظہار کریں اور اپنی مدد ہمیں پیش کریں۔''

قرآن (حضرت ابراہیمؑ کے الفاظ میں) فرماتا ہے:

''بارالہا! لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق کر دے۔''

امامؑ، جابر جعفی کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات میں انہیں تلقین کرتے ہیں کہ کسی سے نہ کہنا کہ تم کوفہ سے ہو' ظاہر یہ کرنا کہ تمہارا تعلق مدینہ سے ہے۔ اسی طرح اپنے نوآموز شاگرد کو (جس میں گویا اسرار امامت اور تشیع کو تحمل کرنے کی بہت زیادہ قابلیت ابتدا ہی سے نمایاں تھی) رازداری کا درس دیتے ہیں۔ یہی مستعد شاگرد ہیں جو بعد میں صاحب راز امامؑ کے طور پر پہچانے جاتے ہیں اور خلافت کی مشینری کے ساتھ ان کا کام یہاں تک پہنچتا ہے۔

۱۔ امامؑ کی جانب سے فضیل کی تعریف کے بارے میں قاموس الرجال۔ ج ۷۔ ص ۳۴۳۔۳۴۵ دیکھیے۔

ایک تنظیمی رابطے کا وجود

نعمان ابن بشیر کہتے ہیں کہ میں حج کے سفر میں جابر کے ساتھ تھا۔ مدینہ میں وہ ابی جعفرؑ (امام محمد باقر علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آخری دن ان سے الوداعی ملاقات کی اور مسرت کے ساتھ باہر نکلے۔ ہم کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستہ میں ایک منزل پر ایک شخص ہمارے پاس آیا (نعمان نے اُس شخص کی نشانیاں اور جابر کے ساتھ ہونے والی اُس کی مختصر گفتگو کو نقل کیا ہے) اور ایک خط جابر کے حوالے کیا۔ جابر نے خط کو چوما' آنکھوں سے لگایا اور اس کے بعد کھول کر پڑھا۔ میں نے دیکھا جوں جوں وہ خط پڑھتے جاتے تھے ان کا چہرہ اترتا چلا جاتا تھا۔ انہوں نے خط کو ختم کر کے اسے تہہ کیا اور ہم چلتے چلتے کوفہ پہنچ گئے' لیکن اس اثنا میں' میں نے جابر کے چہرے پر خوشی نہ دیکھی۔

کوفہ آنے کے اگلے روز میں جابر کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے ملاقات کو گیا۔ [وہاں پہنچ کر] ناگہاں ایک حیرت انگیز منظر میرے سامنے تھا۔ جابر کسی بچے کی مانند ایک لاٹھی پر سوار ہیں اور بھیڑ کے ٹخنے کی ہڈی کا گردن بند اپنے گلے میں ڈالے بے سروپا شعر پڑھتے ہوئے گھر سے نکل رہے ہیں۔ مجھ پر نگاہ ڈالی مگر کچھ بولے نہیں' میں نے بھی کوئی بات نہیں کی' لیکن یہ صورتحال دیکھ کر مجھے رونا آ گیا۔ بچے میرے اور ان کے گرد جمع ہو گئے اور وہ اپنے ہی خیالوں میں چل پڑے اور رحبہ تک جا پہنچے' بچے ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔۔۔ لوگ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ جابر بن یزید دیوانہ ہو چکا ہے۔

چند روز نہ گزرے تھے کہ خلیفہ (ہشام بن عبدالملک) کا خط حاکم کوفہ کے پاس پہنچا' جس میں تحریر تھا کہ تحقیق کر کے بتاؤ کہ یہ جابر بن یزید جعفی نامی شخص کون ہے؟ اس کو گرفتار کرو' اس کی گردن اُڑا دو اور اس کا سر میرے پاس بھیج دو۔

حاکم اپنے حاشیہ نشینوں سے جابر کا پوچھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اے امیر تم پر سلامتی ہو' وہ ایک علم و دانش حدیث کا حامل مرد تھا' اس سال اس نے حج کیا اور دیوانہ ہو گیا۔ اس وقت بھی وہ

''رحبہ'' میں ڈنڈے پر سوار بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہے۔ نعمان کہتا ہے کہ حاکم اطمینان حاصل کرنے کے لیے جابر اور ان بچوں کو قریب سے دیکھنے کے لیے جاتا ہے اور انہیں ڈنڈے پر سوار کھیلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ پس کہتا ہے خدا کا شکر کہ اس نے مجھے اس کے قتل سے معاف رکھا۔(۱)

یہ امامؑ کے اپنے اصحاب سے رابطہ کی کیفیت کا ایک نمونہ ہے اور ایک پیوستہ اور نپے تلے تنظیمی رابطے کو نمایاں کرتا ہے اور ان اصحاب کے بارے میں حکومت کے اختیار کردہ موقف کا بھی ایک نمونہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں خلافت ہے (وہ ہر چیز سے زیادہ اپنی حکومت کی قوت کی حفاظت اور اپنی پوزیشن کو مستحکم تر بنانے کے لیے سوچتے ہیں) وہ امامؑ کے نزدیکی اصحاب سے روابط اور ان کی اجتماعی سرگرمیوں سے بالکل بے خبر نہیں رہتے اور ان کی سن گن لیتے رہتے ہیں اور ان کا کھوج لگانے اور ان سے مقابلے پر کمربستہ رہتے ہیں۔ (۲) بتدریج آنحضرتؑ اور تشیع کی عمومی فضا میں اعتراض آمیز تبدیلی پیدا ہونے لگتی ہے اور شیعہ اماموں کی تاریخِ زندگی میں ایک نئی فصل کے آغاز کی نوید سناتی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کا نسبتاً شدید موقف

اگر چہ اسلامی تاریخ کے متون (Text) نیز کتب احادیث وغیرہ میں صراحت کے ساتھ امام محمد باقر علیہ السلام کی تعارض آمیز اور نسبتاً شدید سرگرمیوں کا ذکر نہیں ملتا (البتہ اس کے اپنے چند علل و اسباب ہیں جن میں سے اہم ترین سبب' حکمرانوں کی طرف سے گھٹن زدہ ماحول اور امامؑ کے معاصر اصحاب کی طرف سے تقیہ کی ضرورت ہے جو کہ امامؑ کی سیاسی زندگی سے مطلع ہونے کا

۱۔ قاموس الرجال۔ ج ۲۔ص ۲۸۲۔ ۲۸۳

۲۔ اس حقیقت کی جابر کا قصہ اور دوسرے اسی طرح کے متعدد قصے صریحاً تائید کرتے ہیں' جس طرح سے عبداللہ بن معاویہ جعفری کی ایک روایت کہ جس میں وہ امام باقر علیہ السلام کے نام حاکم مدینہ کے دھمکی آمیز پیغام کو نقل کرتے ہیں۔ (رجوع کیجیے: بحارالانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۲۴۶)

واحد ذریعہ تھا) لیکن ہمیشہ زیرک دشمن کی جانب سے متعین اور نپے تلے ردعمل کے ذریعے انسان کے عمل کی گہرائی کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔

ہشام بن عبدالملک' مقتدر اور ایک مدبر مشینری کا حامل حکمران کہ جسے مورخین امویوں کا مقتدر ترین خلیفہ قرار دیتے ہیں' اگر وہ امام محمد باقر علیہ السلام یا کسی بھی دوسرے فرد کے ساتھ سخت روی کا مظاہرہ کرتا ہے' تو بے شک اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے اُن کے عمل اور روش سے اپنے لیے خطرے کی بو آرہی ہے اور اُن کا وجود اس کے لیے ناقابل برداشت ہورہا ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ اگر امام محمد باقر علیہ السلام فقط علمی سرگرمیوں (فکری اور تنظیم سازی کے کاموں میں نہیں) میں مشغول ہوتے تو خلیفہ اور دربار خلافت کے چوٹی کے لوگ اپنا مفاد اور مصلحت اس میں نہ دیکھتے کہ سخت گیری اور شدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اولاً آپؑ کو اپنے خلاف تندوتیز مقابلے پر ابھاریں (جیسا کہ قریب کے زمانے میں ہم اس کا ایک نمونہ دیکھتے ہیں جس میں امام حسین ابن علیؑ کا قیام بھی شامل ہے) ثانیاً امامؑ کے دوستوں اور معتقدین کا گروہ (جن کی تعداد بھی کم نہ تھی) کو اپنے خلاف غصے میں لائیں اور اپنی مشینری سے ناراض کریں۔ مختصر یہ کہ امام محمد باقر علیہ السلام کی عمر کے آخری حصے میں حکومت کے نسبتاً شدید ردعمل سے آپؑ کی جانب سے نسبتاً شدید عمل کا استنباط (قیاس) کیا جاسکتا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کو شام طلب کرنا

امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کے آخری ایام کے واقعات میں سے سب سے زیادہ معروف واقعہ اموی دارالخلافہ شام میں آپؑ کو طلب کرنا ہے۔ خلافت کے مقابل امامؑ کے موقف کی نوعیت جاننے کے لیے اموی خلیفہ حکم دیتا ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام (اور بعض روایات کے مطابق ان کے جوان بیٹے' مددگار اور ساتھی امام جعفر صادقؑ کو بھی) کو اسیر کر کے شام روانہ کیا جائے۔

امامؑ کو شام میں خلیفہ کے محل میں لاتے ہیں۔ ہشام پہلے ہی سے اپنے درباریوں اور حاشیہ

نشینوں کو امامؑ کے دربار میں حاضر ہونے کے موقع کے لیے ضروری احکامات صادر کرتا ہے۔ طے کیا جاتا ہے کہ پہلے خود خلیفہ اور اس کے بعد حاضرین مجلس (جو سب کے سب ممتاز شخصیات اور سردار ہیں) امامؑ پر الزامات اور طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کریں گے۔ وہ اس عمل سے دو مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

پہلا مقصد یہ کہ تندروی کر کے اور برا بھلا کہہ کر امامؑ کے حوصلے پست کر دے اور ماحول کو ہر اس کام کے لیے تیار کر دے جو اسے ضروری محسوس ہو اور دوسرا یہ کہ اپنے دشمن کو اس ملاقات میں جو دو مخالف دھڑوں کے اعلیٰ ترین قائدین کے درمیان ہو رہی ہے' شکست سے دوچار کر دے اور پھر اس کے دھڑے کے تمام افراد اس شکست کی خبر (جو خلیفہ کے ہمیشہ تیار ترجمانوں مثلاً خطبا' اہلکاروں اور خلیفہ کے ذاتی جاسوسوں کے ذریعے پھیلائی جا سکتی ہیں) نشر کر کے [مخالف دھڑے کو] پسپائی پر آمادہ کر دے۔

امامؑ دربار میں داخل ہوتے ہیں اور اس سنت اور معمول کے برخلاف جس کے مطابق ہر نئے آنے والے پر لازم تھا کہ وہ خلیفہ کو اس کے مخصوص خطاب "امیر المومنین" کے ساتھ سلام کرے' آپؑ تمام حاضرین کی طرف رخ کرتے ہیں اور ہاتھ کے اشارے سے سب کو مخاطب کر کے "السلام علیکم" کہتے ہیں اور پھر اجازت کا انتظار کیے بغیر تشریف فرما ہو جاتے ہیں۔

ہشام کی فضول گوئی

امامؑ کے اس طرز عمل سے ہشام کے دل میں کینے اور حسد کی آگ کے شعلے بلند ہونے لگتے ہیں اور وہ اپنے پروگرام پر عمل شروع کر دیتا ہے۔

"تم (اولاد علیؑ) نے ہمیشہ مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کیا ہے اور انہیں اپنی طرف دعوت کے ذریعے ان کے درمیان رخنہ اور نفاق ڈالا ہے اور جہالت اور نادانی کی بنا پر خود کو ان کا امام اور پیشوا تصور کیا ہے۔"

وہ کچھ دیر یہ لغویات بکنے کے بعد خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے غلاموں اور

نمک خواروں میں سے ہر ایک اسی طرح کی باتیں کرتا ہے اور ہر ایک اپنے انداز سے امامؑ کو تہمت اور ملامت کا نشانہ بناتا ہے۔

ہشام کے دربار میں امامؑ کی تقریر

اس پوری مدت میں امام خاموشی اور اطمینان کے ساتھ تشریف فرما رہے اور جب سب خاموش ہو گئے تو امام اٹھے' کھڑے ہو کر حاضرین کی جانب رخ کیا اور حمد و ثنائے الٰہی اور پیغمبرؐ پر درود و سلام کے بعد مختصر اور جھنجوڑ دینے والے جملات میں اس منتشر لیکن یکجا نظر آنے والے گروہ کے فکری انتشار اور بے مقصدیت کو ان کے سامنے آشکار کیا۔ ان کے بے اختیار اور آلۂ کار ہونے کو ایک تازیانے کی طرح ان کے سروں پر برسایا' اپنے مقام اور اپنے گھرانے کے پُر افتخار ماضی کو' جو اعلیٰ ترین اسلامی معیار (ہدایت) پر منطبق ہوتا ہے' واضح کیا اور آخر میں اپنی راہ کے نیک انجام کو جو تاریخ میں جاری خدا کی سنتوں کے مطابق ہے' پیش کیا' اور ان کے متزلزل حوصلوں کو مزید متزلزل کر دیا:

"أَيُّهَا النَّاسُ أَيْنَ تَذْهَبُونَ؟ وَأَيْنَ يُرَادُ بِكُمْ؟ بِنَا هَدَى اللهُ أَوَّلَكُمْ، وَبِنَا يَخْتِمُ آخِرَكُمْ. فَإِنْ كَانَ لَكُمْ مُلْكٌ مُعَجَّلٌ فَإِنَّ لَنَا مُلْكًا مُؤَجَّلًا، وَلَيْسَ بَعْدَ مُلْكِنَا مُلْكٌ، لِأَنَّا أَهْلُ الْعَاقِبَةِ يَقُولُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ: وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔" (۱)

"اے لوگو! کہاں جا رہے ہو؟ اور تم نے اپنے لیے کس انجام کا انتخاب کیا ہے؟ ہمارے ہی وسیلوں سے خدا نے تمہارے اسلاف کی ہدایت کی تھی اور ہمارے ہی ذریعے سے

۱۔ حکومت کے اعلیٰ ترین مقامات پر فائز اور دربار میں اس عظمت اور حساسیت کے ساتھ خلیفہ کے گرد بیٹھے اور اس کے دفاع پر کمربستہ درباریوں کو "أَيُّهَا النَّاسُ" کہہ کر مخاطب کرنا' درحقیقت ان تمام فضیلتوں کا انکار ہے جو اس طاغوتی معاشرے میں ان متکبروں کو "عَامَّةُ النَّاسِ" سے جدا کرتی تھیں اور انہیں ایک خاص شخصیت بناتی تھیں۔ ایک سادہ خطاب کے لباس میں ایک اصولی اور گہری جنگ۔

تمہارے انجام کار پر مہر لگے گی۔ اگر تمہیں ابھی عارضی حکومت حاصل ہے تو ہمارے لیے ایک دیرپا حکومت ہوگی اور ہماری حکومت کے بعد کسی کی حکومت نہ ہوگی کہ ہم ہی اہلِ عاقبت ہیں اور خدا نے فرمایا ہے: عاقبت متقین کے لیے ہے۔"

اس مختصر اور پُر معنی بیان میں (جس کے اندر شکایت و مذمت' نوید اور تہدید' اثبات اور ردّ پہلو بہ پہلو یکجا نظر آتے ہیں) اس قدر تاثیر اور گہرائی پائی جاتی ہے کہ اگر یہ نشر ہو جائے اور لوگوں کے کانوں تک جا پہنچے تو ممکن ہے کہ ہر سننے والے کو بولنے والے کی حقانیت کا معتقد بنا دے۔ اس کلام کا جواب دینے کے لیے اسی قدر عمدہ خطابت اور سخنوری درکار ہے جتنی کہ خود اعتمادی اور خود پر یقین۔۔۔ اور یہ سب چیزیں امامؑ کے مخاطبوں میں نہیں پائی جاتیں' لہٰذا اب درشتی اور ظلم و جبر کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

امامؑ کی اسیری اور جلاوطنی

ہشام حکم دیتا ہے کہ امامؑ کو قید خانے میں ڈال دیا جائے۔ یعنی وہ عملاً اپنے پست حوصلے اور اپنی منطق کی کمزوری کا اعتراف کرتا ہے۔ قید خانے میں امامؑ حقائق بیان کرتے ہیں اور دوسرے قیدیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں' یہاں تک کہ قیدیوں میں سے کوئی ایسا نہیں بچتا جو آپؑ کی باتوں کو دل سے قبول نہ کرے اور آپؑ سے متاثر نہ ہو۔ قید خانے کے اہلکار ان واقعات کی خبر ہشام کو دیتے ہیں۔ یہ صورتحال اس مشینری کے لیے جو بیسیوں سال سے خصوصاً شام کو علوی تبلیغات کی دسترس سے دور رکھے ہوئے ہے' کسی صورت قابلِ قبول نہیں تھی۔

ہشام حکم دیتا ہے کہ امامؑ اور ان کے ساتھیوں کو قید سے نکالا جائے۔ ان کے لیے مدینہ سے زیادہ مناسب جگہ کوئی اور نہیں' یعنی وہ شہر جس میں وہ زندگی بسر کرتے تھے' البتہ ان ہی نگرانیوں اور سخت گیریوں کے ساتھ بلکہ ان سے بھی بڑھ کر۔۔۔ اور ضرورت محسوس ہونے پر' آخری اور بے آواز وار کر کے حریف کو اس کے بستر پر اور اس کے اپنے گھر کے اندر نابود کرنا اور "قتلِ امام" کا وبال بھی اپنی گردن پر نہ لینا۔۔۔ پس ہشام کے حکم پر ان کو تیز رفتار سواریوں (جو بغیر رُکے پورا

راستہ طے کر جائیں) پر بٹھا دیتے ہیں اور مدینے کی سمت روانہ کر دیتے ہیں۔ پہلے ہی سے یہ حکم جاری کر دیا جاتا ہے کہ راستے میں آنے والے شہروں میں سے کسی کو اس مغضوب قافلہ کے ساتھ لین دین کرنے اور انہیں کھانے پینے کی اشیا فروخت کرنے کا حق نہیں۔ (۱)

۱۔ بعض روایات کے مطابق راستے میں آنے والے شہروں کے لوگوں پر اس طرح ظاہر کیا گیا تھا کہ محمد ابن علی اور جعفر ابن محمد دین اسلام چھوڑ کر عیسائی ہو گئے ہیں۔ (بحار الانوار ج ۴۶۔ ص ۳۰۶)

اس سے ملتا جلتا واقعہ انیسویں صدی کے درمیانی عشروں میں ہندوستان کی تحریک آزادی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (ہندوستان کے) مولانا جو کہ معروف اور معتبر مذہبی علما میں سے تھے اور مسلمانانِ ہند کی تحریک مزاحمت کے ابتدائی قائدین اور برصغیر کی تحریک آزادی کے سرخیلوں میں ان کا شمار ہوتا تھا' مزاحمت کے مخالف بعض مولویوں نے انہیں "وہابی" کے طور پر متعارف کروایا۔ اس تہمت کے لیے انہیں کسی جواز اور بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اس محبوب' معروف اور مجاہد شخصیت کو بے خبر اور سوئی ہوئی عوام کی نظروں میں بے اعتماد اور بے اعتبار قرار دیا جائے اور اس مقصد کے لیے ان پر وہابی کی تہمت لگا دینا ایک مناسب ذریعہ تھا۔ حجاز کے اندر وہابی فرقے کی اعتقادی اور عملی تباہ کاریاں' جو کہ ایک علیحدہ قصہ ہیں' اس دور کے استعمار کا بھڑکایا ہوا آگ تھا جو اس زمانے میں نیا نیا وجود میں آیا تھا اور جس کے خلاف تمام اسلامی ممالک میں غم وغصہ اور نفرت کی لہر وجود میں آ چکی تھی اور وہابیت کی تہمت ہر جگہ محبوب ترین شخصیت کو بھی نظروں سے گرا سکتی تھی۔ عامۃ الناس ٹھیک طرح سے نہیں جانتے تھے اور نہ جان سکتے تھے کہ وہابیت کیا ہے' اس کی بنیاد کیا ہے' وہ کیا کہتی ہے اور کیا کرنا چاہتی ہے اور یہ پاک باز علما جنہوں نے اپنی پوری زندگی انگریز سامراج کے ساتھ مقابلے میں بسر کی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ وہابی (یعنی انگریزوں کے آلہ کار) ہو سکتے ہیں؟ واحد چیز جو انہیں معلوم تھی' وہ یہ تھی کہ وہابیت ایک غلط اور انحرافی مسلک ہے اور اب وہ یہ سن رہے تھے کہ یہ مجاہد علما وہابی ہیں۔ اور اتنا ہی کافی تھا۔ (دیکھئے: کتاب مسلمانان در نہضت آزادی ہندوستان۔ طبع آسیا)

میں جب امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کو شام لے جانے اور ان پر عیسائیت کی تہمت لگائے جانے کے واقعے کی تطبیق ایک سو کچھ سال پہلے ہندوستان میں پیش آنے والے اس واقعے سے کرتا ہوں اور اس کے بعد خود اپنے زمان و مکان میں جاری حال و احوال پر نظر ڈالتا ہوں تو ایک تاسف آمیز حیرت کے ساتھ یہ عربی مصرعہ میرے ذہن میں آ جاتا ہے کہ: "اَلنَّاسُ کَالنَّاسِ وَالْاَیَّامُ وَاحِدَةٌ" ("لوگ ہمیشہ ایک جیسے ہوتے ہیں اور زمانے بھی یکساں ہی ہوا کرتے ہیں۔)

اسی حالت میں یہ لوگ تین شب وروز چلتے ہیں اور ان کے پاس موجود پانی اور خوراک کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے۔

تاریخ کا دہرایا جانا

اب یہ حضرات شہر مدینہ پہنچتے ہیں۔ اس شہر کے باشندے حکم کے مطابق شہر کے دروازے بند کر دیتے ہیں اور انہیں ضروری سامان فروخت کرنے سے منع کر دیتے ہیں۔ امامؑ کے اصحاب بھوک و پیاس سے تنگ آ چکے ہیں۔ امامؑ ایک اونچے مقام پر چلے جاتے ہیں اور بلند آواز سے شہر والوں تک اپنی فریاد پہنچاتے ہیں!

"اے ستم پیشہ شہر کے لوگو! میں ذخیرۂ الٰہی ہوں، جس کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ ذخیرہ تمہارے لیے بہترین (بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ) ہے اگر تم مومن ہو۔"

یہ بروقت ہوشیاری و جرأت اس سازش کو ناکام بنا دیتی ہے۔ شہر کے لوگوں میں سے ایک فرد اپنے فریب خوردہ اور بے خبر ہم وطنوں کو ہوشیار کرتا ہے اور انہیں یاد دلاتا ہے کہ یہ وہی پکار ہے جو شعیب پیغمبرؑ نے اپنے زمانے کے گمراہوں کے سامنے بلند کی تھی۔ وہ انہیں سمجھاتا ہے کہ آج وہ اسی پکار کے سامنے کھڑے ہیں جس کے سامنے ایک روز ان کے اسلاف کھڑے تھے اور آج یہ لوگ اپنے اسلاف کو یہ پکار نہ سننے پر لعن و نفرین کرتے ہیں۔

جی ہاں! تاریخ دہرائی جا رہی ہے آج وہی پیام، وہی پیام رساں اور وہی مخاطبین۔۔۔ یہ بروقت کلام دلوں میں اتر جاتا ہے اور وہ دروازے کھول دیتے ہیں اور دربارِ خلافت کے منصوبے کے برخلاف ان کے دشمن کا استقبال کرتے ہیں۔ (۱)

اس تاریخی روایت کا آخری حصہ (جو ایک طرف تو چند پہلوؤں سے اس زمانے کی سیاسی صورتحال، گھٹن اور ہمہ جانبہ حماقت کو نمایاں کرتا ہے اور دوسری طرف بنی امیہ کی حکومتی مشینری کے مقابلے میں امام محمد باقر علیہ السلام کے مخصوص موقف کو واضح کرتا ہے) یوں ہے:

۱۔ بحار الانوار، ج ۴۶، ص ۲۶۳ نقل از کافی

جب ہشام کو مدینہ کے واقعہ کی خبر پہنچاتے ہیں تو وہ حکم دیتا ہے کہ سب سے پہلے تو اُس گستاخ شخص کو جس نے سربراہانِ حکومت کی تیار کردہ سازش کے برخلاف بات کرنے کی جرأت کی اور لوگوں کو اس عظیم غفلت سے نجات دلائی' اسے اپنی خیانت کی سزا دی جائے۔ چنانچہ خلیفہ کے حکم پر اس شخص کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

براہِ راست جنگ سے پرہیز

اس سب کے باوجود امامؑ معاشرے پر مسلط طاقت سے براہِ راست مقابلہ اور جنگ کرنے سے اجتناب برتتے ہیں' تلوار نہیں اٹھاتے اور وہ ہاتھ جو بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور حالات سے ناواقفیت کی بنا پر تلوار کا قبضہ تھام لیتے ہیں' ان کو قبضۂ شمشیر سے دور کر دیتے ہیں اور انہیں زیادہ دُور اندیشی اور بہتر وقت شناسی کی ترغیب دیتے ہیں تیز زبان کی تلوار کو بھی جب تک بنیادی ضرورت کا تقاضا نہ ہو' نیام ہی میں رکھتے ہیں۔ اپنے بھائی زید کو' جن میں پُرجوش احساسات کے زیرِ اثر تابِ تحمل نہیں رہی تھی اور ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا' قیام کی اجازت نہیں دیتے۔

اپنے روزمرہ کے تعلقات میں اور نہ آزمائے ہوئے عناصر کے ساتھ روابط کے دوران زیادہ تر علمی اور فکری سرگرمیوں پر زور دیتے' یہ کام جو نظریاتی بنیادیں رکھتا بھی تھا اور سیاسی تقیہ بھی۔ لیکن (جیسا کہ بیان شدہ مختصر اشاروں سے سمجھ میں آتا ہے) یہ حکیمانہ تدبیر (technique) اس بات کا موجب نہیں بنتی کہ امامؑ اپنے نزدیکی اصحاب اور سچے شیعوں کے سامنے' جو اُن کے راستے کی طرف مائل بھی ہیں' امامت کی کلی سمت کو پیش نہ کریں اور عظیم شیعہ مقاصد (جو ناقابلِ اجتناب جہاد کے ذریعے اسلامی نظام اور حکومتِ علوی کا قیام ہے) کو ان کے دلوں میں زندہ نہ کریں' حتیٰ کہ مناسب مواقع پر جذبات کو بھی ضروری حد تک اس راہ پر نہ اُبھاریں۔

امام محمد باقر علیہ السلام کا امید بخش طرزِ عمل

ایک خوش آئند مستقبل کی نوید جو بہت زیادہ دور بھی نہیں امام محمد باقر علیہ السلام کے امید بخش طرزِ عمل کا حصہ ہے اور ساتھ ہی اس بات کو بھی نمایاں کرتا ہے کہ شیعوں کی تدریجی حرکت میں امام اپنے مقام کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کہاں اور کس مرحلہ میں ہیں۔

''ہم حضرت ابوجعفرؑ کے ساتھ تھے اور آپؑ کا گھر بھرا ہوا تھا کہ ایک بوڑھا شخص داخل ہو کر سلام کرتا ہے اور کہتا ہے:

اے فرزند رسولؐ! خدا کی قسم میں آپؑ کو اور آپؑ کے محبوں کو دوست رکھتا ہوں اور خدا کی قسم یہ دوستی زندگی کی آسائشوں کے لالچ میں نہیں ہے۔ میں آپؑ کے دشمنوں سے دشمنی رکھتا ہوں اور ان سے بیگانہ اور بیزار ہوں اور اس کینے اور عداوت کی وجہ ہمارے اور ان کے درمیان بہنے والا خون نہیں ہے۔ خدا کی قسم! میں آپؑ کے امر و نہی کو قبول کرتا ہوں اور آپؑ کی کامیابی اور فتح مندی کے زمانے کی آمد کا منتظر ہوں۔ کیا آپؑ کو میرے لیے کوئی امید دکھائی دیتی ہے؟ میں آپؑ پر فدا ہو جاؤں!

امامؑ نے اس شخص کو اپنے قریب بلایا اور اپنے پہلو میں بٹھایا پھر فرمایا: اے بزرگوار! کسی نے میرے والد علی ابن حسینؑ سے ہو بہو یہی بات پوچھی تھی۔ میرے والد نے اسے جواب دیا تھا کہ اگر یہ انتظار کرتے ہوئے تمہاری موت واقع ہو جائے تو تم پیغمبرؐ، علیؑ، حسنؑ، حسینؑ اور علی ابن حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہو گے، تمہارا دل ٹھنڈا، تمہاری آرزو پوری اور تمہاری آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ اور خدا کے عظیم انبیا کے ہمراہ آسائش اور کشائش کی آغوش میں جگہ پاؤ گے۔۔۔۔ اور اگر زندہ رہے تو اسی دنیا میں ایک ایسا دور بھی دیکھو گے جس میں تمہاری آنکھیں روشن ہو جائیں گی اور اس زمانے میں تم ہمارے ساتھ اور ہمارے پہلو میں عظیم ترین مقام کو طے کرو گے۔۔۔۔

وہ بوڑھا چلا جاتا ہے اور امامؑ اس کو دیکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی جنتی انسان کو

دیکھنا چاہتا ہے تو وہ اس شخص کو دیکھ لے۔"(۱)

بسا اوقات تو اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور کامیابی کے سال کی نشاندہی فرماتے ہیں اور شیعوں کی دیرینہ آرزو کو جامہ حقیقت پہناتے ہیں۔ ابو حمزہ ثمالیؒ کہتے ہیں! میں نے ابو جعفرؑ سے سنا کہ آپؑ فرما رہے تھے:

"خدا نے اس کام (حکومت علوی کی تشکیل) کے لیے ۷۰ ہجری کو معین کیا تھا لیکن جب حسینؑ مقتول ہوئے تو خدا اہل زمین سے ناراض ہو گیا۔ پس اس نے ۱۴۰ ہجری تک کے لیے مؤخر کر دیا۔۔۔۔ میں نے اس وقت کو تمہارے (قریبی دوستوں کے) لیے بیان کیا اور تم نے اس کو فاش کر دیا اور اس راز پر پڑے ہوئے پردے کو چاک کر دیا۔ اس کے بعد خدا نے کسی اور وقت اور وعدے کو ہمارے نزدیک معین نہیں کیا۔ اور خدا جس چیز کو چاہتا ہے' مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے' ثبت کر دیتا ہے۔"

ابو حمزہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات ابی عبداللہؑ کی خدمت میں عرض کی۔ انہوں نے فرمایا کہ ہاں ایسا ہی تھا۔(۲)

اس قسم کے بیانات اس گھٹن زدہ اور مہلک دباؤ کے ماحول میں' نظام اسلامی اور حکومت علوی کی تشکیل کو ایک خوشنما خواب کی طرح' ستم زدہ شیعوں کے دل میں امید کی واحد کرن کے طور پر روشن کرنے اور حرکت پیدا کرنے کا سبب بنتے تھے۔ نظام اسلامی اور حکومت کی تشکیل کو حتمی اور ناقابل انکار مستقبل کی صورت میں پیش کرتے تھے اور اس طرح ان طویل فاصلوں کو طے کرنے کے لیے ان میں قوت اور حوصلہ پیدا کرتے تھے۔

ناہموار راستے پر انیس (۱۹) سالہ جدوجہد

ایک سیدھے' مستقل اور روشن راستے کی مانند امامؑ کی انیس (۱۹) سالہ رہبری کا زمانہ اس

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۳۶۱' ۳۶۲

۲۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۶۸

صورت سے طے ہوا۔ وہ انیس سال جن میں نظریاتی تعلیم بھی ہے' افراد سازی بھی' جنگی حربے بھی ہیں اور تنظیم سازی بھی' سیاسی موقف کی حفاظت اور اسے مسلسل جاری رکھنا بھی ہے اور تقیہ بھی' اور ساتھ ہی ساتھ زیادہ سے زیادہ اور محکم امید کی شمع روشن کرنا بھی شامل ہے۔۔۔ مختصر یہ کہ انیس سالہ مبارزہ اور سنگلاخ اور دشوار گذار راستے پر جدوجہد۔۔۔

اور آخرکار جب یہ مختصر اور پُر برکت عمر ختم ہوتی ہے' تو علوی تحریک کے جانی دشمن اس تحریک کے روحِ رواں کے رخصت ہونے پر سمجھتے ہیں کہ سکھ کا سانس لیں گے۔ اور شیعی تبلیغاتی جدوجہد' جس کے نتیجے میں انہیں ملک کی اندرونی اور بیرونی سرحدوں پر بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا' سے اپنے آپ کو آزاد سمجھنے لگے' تو ایسے میں اس بھڑکتے ہوئے' گرم اور جھلسا دینے' خاکستر کر دینے والے مرکز سے اموی حکومت کی بنیادوں پر آخری بجلی گرتی ہے۔

جس نے اپنی ساری عمر لوگوں کو بیدار کرنے اور اس حکومت کے کرتوتوں سے پردہ اٹھانے میں بسر کی تھی' وہ اپنی موت کے بعد بھی اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ جو اپنی زندگی میں بھی لوگوں کو شعور دیتا تھا وہ موت کے بعد بھی اس جدوجہد کو جاری رکھتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کے لیے اور ان بے خبر عوام الناس کی کثیر تعداد کے لیے جن میں سمجھنے اور سوچنے کی تشنگی پائی جاتی ہے' ایک تازہ درس اور نیا پیغام پہنچاتا ہے۔ اس پیغام میں بھی وہی سکون اور گہرائی تھی جو ان کی زندگی میں بطور کلی ایک سوچے سمجھے منصوبے کی طرح جاری رہی تھی۔ وہ اپنے دوستوں اور ضرورت مندوں کو مستفید کرتے ہیں لیکن دشمن کی نیند میں خلل واقع نہیں ہونے دیتے۔ یہ امام محمد باقر علیہ السلام کے تقیہ کا ایک نمونہ ہے اور اس خاص زمانی مرحلے میں ان کی عمومی وضع اور طرزِ عمل کی علامت ہے۔

موت کے بعد جہاد کا منصوبہ

جن لوگوں نے بعد میں امامؑ کی تاریخِ حیات رقم کی ہے' انہوں نے بھی اس عظیم اقدام سے' جسے ایک چھوٹی سی حدیث میں سمو دیا گیا ہے' غفلت یا تغافل برتا ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اس پر نظر ہی نہیں پڑی؟!!

مختصراً بیان کرتے ہیں۔ بظاہر ماجرا یہ ہے کہ امامؑ اپنے فرزند جعفر ابن محمدؑ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ان کے اموال میں سے کچھ حصہ (۸۰۰ درہم) دس سال کے عرصے میں ان کی عزاداری اور ان پر رونے کے لیے خرچ کریں۔ اس عزاداری کا مقام منیٰ کا میدان ہے اور وقت ایام حج (۱) بس اتنا ہی۔

حج کے ایام دور افتادہ اور ناآشنا بھائیوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ اس وقت اور اس جگہ پر ہزاروں "افراد" "جمعیت" بننے اور "جمع" ہونے کا تجربہ کرتے ہیں۔ یہ ہم زبان نہ سہی لیکن ہم دل لوگ وہاں ایک ہی زبان میں خدا کو پکارتے ہیں اور مختلف اقوام کے ایک ہی پرچم تلے جمع ہونے کا معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

اگر کوئی ایسا پیغام ہو جسے پورے عالم اسلام تک پہنچانا مقصود ہو تو اس کے لیے اس سے زیادہ مناسب کوئی اور موقع نہیں ہو سکتا۔ اب جب کہ مناسکِ حج مسلسل چند روز انجام دیے جاتے ہیں اور چند مقامات پر، تو ان میں سے کون سا دن اور کون سا مقام زیادہ مناسب ہے؟

مکہ ایک شہر ہے اور شہر میں لوگ پھیلے ہوئے بھی ہوتے ہیں اور مصروف بھی۔ اس کے علاوہ یہاں پر سب ہی مناسکِ حج میں مشغول ہوتے ہیں، طواف، سعی، نماز وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ مشعر رات کو ٹھہرنے کی جگہ ہے، جہاں وقت بھی بہت کم ہے اور امکان بھی نہیں ہوتا۔ یہ منیٰ کے راستے میں پڑنے والے ایک اسٹیشن سے زیادہ نہیں ہے۔ عرفات اگرچہ دن میں ٹھہرنے کا مقام ہے لیکن ایک مختصر مدت کے لیے، صرف ایک دن، صبح کے وقت سفر کی تھکن اور عصر کے وقت سفر کی تیاری۔ سب سے زیادہ مناسب جگہ منیٰ ہے۔ حاجی عرفات کے سفر سے واپسی پر تین راتیں یہاں گزارتا ہے اور ایک دوسرے سے تعارف، باہمی گفتگو اور ایک دوسرے کے دکھ درد سننے کی فرصت یہاں ہر جگہ سے زیادہ میسر ہوتی ہے۔ کون ہے جو دن کے وقت مکہ جانے اور وہاں سے

۱۔ عن أبي عبد الله قال: قال لي أبي: يا جعفر أوقف لي من مالي كذا و كذا لنوادب تندبني عشر سنين بمنى أيام منى (بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۲۱۵، ۲۲۰)

آنے کی زحمت برداشت کرے گا؟ وہاں ٹھہرنے اور ہر گروہ' ہر محفل اور ہر اجتماع کے پاس جا کر ملنے کا ایک مناسب مقام اور وقت ہوتا ہے۔

قدرتی طور پر ہر ایک کا گزر اس مجلس عزا سے ہوتا جو ہر سال ان تین دنوں میں اس میدان میں برپا ہوتی۔ رفتہ رفتہ دنیا بھر کے لوگ اس سے واقف ہو گئے۔ برسہابرس سے اہل مدینہ (جو کہ اسلام کا مرکز اور صحابہ' فقہا اور اکابر محدثین کا مسکن ہے) کا ایک گروہ یہاں پر اور ان ایام میں ایک مجلس منعقد کرتا ہے۔

کس کے لیے؟

عالم اسلام کی ایک ممتاز ترین شخصیت کے لیے'

محمد ابن علی ابن الحسینؑ کے لیے'

خاندان پیغمبرؐ کے ایک عظیم فرد کے لیے'

فقہا اور محدثین کے سردار کے لیے'

فقہ و حدیث کی تمام نامور شخصیات کے استاد کے لیے۔

آخر کیوں ہر جگہ سے یہاں آتے ہیں اور ہر جگہ کو چھوڑ کر یہاں بولتے ہیں؟

اور آخر بولتے ہی کیوں ہیں؟

کیا ان کی موت طبیعی نہیں تھی؟

کس نے انہیں قتل کیا یا ان کو زہر دیا؟

اور کیوں؟

آخر وہ کیا کرتے تھے اور کیا کہتے تھے؟

کیا ان کا کوئی دعویٰ تھا؟

کیا وہ کسی جانب دعوت دیتے تھے؟

کیا خلیفہ کے لیے کوئی خطرہ تھے؟

اور اسی طرح کی اور باتیں۔ دسیوں سوالات اور ابہامات' اور اس کے پیچھے دسیوں

استفہامات اور کوششیں اور پھر صاحبانِ عزا اور معلومات رکھنے والوں کی طرف سے جوابات کی بھرمار جو اس انبوہِ کثیر میں جگہ جگہ موجود ہوا کرتے تھے۔ ایسے لوگ مدینہ یا کوفہ سے یہاں آیا کرتے تھے اور در اصل اسی لیے آیا کرتے تھے کہ ان سوالوں کے جواب دیں۔ یہ لوگ آتے تھے تاکہ مسائل کو اس بے مثال موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان لوگوں کے سامنے بیان کریں جو پورے عالمِ اسلام سے آ کر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ نیز اپنے بھائیوں اور محبوں سے ملاقات کریں۔ خبروں سے مطلع کریں اور احکامات حاصل کریں۔

مختصراً یہ تھی اس دور میں تبلیغاتی مرکز کے ہزاروں ذرائع (channels) سے شیعی دعوت۔ اور یہ ہے امام محمد باقر علیہ السلام کا کامیاب منصوبہ (موت کے بعد جہاد کا منصوبہ)۔ اور یہ ہے وہ بابرکت وجود جس کی زندگی اور موت خدا کے لیے اور راہِ خدا میں تھی:

"وَجَعَلَنِي مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ۔۔۔۔وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا۔

اور جہاں بھی رہوں بابرکت قرار دیا ہے۔۔۔۔ان پر ہمارا اسلام جس دن پیدا ہوئے اور جس دن انہیں موت آئی اور جس دن وہ دوبارہ زندہ اٹھائے جائیں گے۔(۱)

بنی امیہ کے دور کا ہیجان انگیز زمانہ

امام محمد باقر علیہ السلام نے ۵۷ سال کی عمر میں بنو امیہ کے ایک مقتدر ترین خلیفہ (ہشام بن عبد الملک) کے دور میں شہادت پائی۔ حالات کی پراگندگی اور وسیع و عریض مملکتِ اموی کو لاحق بے شمار مشکلات اور مسائل بھی اس بات میں رکاوٹ نہ ہوئے کہ ہشام شیعی تنظیموں کے روحِ رواں (امام محمد باقر علیہ السلام) کے خلاف سازشوں اور بدسلوکیوں سے غافل ہو جائے۔ اُس کی ہدایت پر اس کے گماشتوں نے امام کو زہر دیا اور اموی طاغوت اور جابر حکمران نے ملک کی مغربی اور مشرقی سرحدوں پر اپنی فتوحات کی لذتوں اور سرمستیوں کو اندرونِ ملک اپنے سب سے

۱۔ سورۂ مریم ۱۹۔ آیات ۳۱،۱۵

بڑے اور خطرناک ترین دشمن کے قتل سے کامل کیا۔

جیسا کہ اشارہ کیا گیا' بنوامیہ کی حکومت امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کے آخری چند برسوں اور ان کے فرزند امام جعفر صادق کی امامت کے ابتدائی برسوں میں اپنے زمانے کے ہیجان انگیز دور سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف شمال مشرقی (ترکستان اور خراسان)' شمالی (برصغیر اور آذربائیجان) اور مغربی سرحدوں (افریقہ' اندلس اور یورپ) پر عسکری قوت نمایاں اور دوسری طرف عراق کے عرب نواحی علاقوں' خراسان اور شمالی افریقہ میں ہونے والی شورشیں جو عموماً یا غالباً یہاں کے ناراض اور مظالم سہنے والی مقامی آبادی اور بسا اوقات مغلانہ طرز عمل کے حامل اموی سرداروں کی تحریک یا مدد سے پے در پے سر اٹھا رہی تھیں۔(۱) اسی طرح پوری مملکت اور بالخصوص عراق میں (جو بنی امیہ کے بڑے زمینداروں کا ٹھکانہ اور بھرپور پیداوار دینے والی املاک کا مرکز تھا' جن میں سے اکثر زمینیں خلیفہ یا حکومتی عمائدین ہی کی ہوتی تھیں) ہشام اور عراق میں اس کے مقتدر گورنر (خالد بن عبداللہ قسری)(۲) کے افسانوی خورد برد اور بالآخر مختلف علاقوں جن میں

۱۔ مؤرخ ان تمام شورشوں کو بلا استثناء خوارج کی طرف منسوب کرتا ہے جو خود ان بغاوتوں اور تحریکوں کے خلاف اموی دربار خلافت کے مخصوص الزام کی نشاندہی کرتی ہے' جن میں سے اکثر یا کم از کم بعض حق طلب بھی ہو سکتی تھیں۔

۲۔ خالد بن عبداللہ قسری پر الزام تھا کہ اس کی سالانہ آمدنی تیرہ ملین ہے۔ ہشام نے اسے خط لکھا کہ جب تک امیرالمومنین کا غلہ فروخت نہ ہو جائے اس وقت تک کوئی اور غلہ فروخت نہ کرے۔ خالد جو دلی طور سے خلیفہ سے راضی نہ تھا' اس نے خطبہ میں کہا: "لوگ کہتے ہیں کہ قیمتوں کو میں بڑھاتا ہوں۔ جس نے قیمتوں میں اضافہ کیا ہے اس پر خدا کی لعنت ہو! (وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ کام خلیفہ کا ہے)۔ ہشام کی بیوی کے پاس ایک ایسا لباس تھا جس کے تار سونے کے تھے اور اس پر بیش قیمت نگینے جڑے ہوئے تھے یہاں تک کہ وہ اس کے بھاری ہونے کی وجہ سے اسے پہن کر چل بھی نہیں سکتی تھی۔ قیمت کا تعین کرنے والوں میں سے کوئی بھی اس کی قیمت کا تعین نہیں کر سکا ہے ۔۔۔۔ خود اس کے پاس سو (۱۰۰) ذراع (کہنی سے ہاتھ کی لمبائی تک) طول اور پچاس (۵۰) ذراع عرض کا ایک فرش تھا جو ریشم اور سونے سے تیار کیا گیا تھا۔ (ابن اثیر۔ ج ۵۔ ص ۲۲۰ اور بین الخلفاء والخلفاء۔ ص ۱۲۸ اور ۵۶)

خراسان، عراق اور شام بھی شامل ہیں قحط اور طاعون نے مسلمان نشین وسیع مملکت میں عجیب وغریب حالات پیدا کر دیئے تھے، جو کہ بنو امیہ کی سرپرستی میں اُس کے ایک معروف ترین حکمران کے ذریعے چلائی جا رہی تھی۔ علاوہ ازیں اس پر عالمِ اسلام کے سب سے بڑے خسارے یعنی معنوی، فکری اور نفسیاتی خسارے کا بھی اضافہ کرنا چاہیے۔

اسلامی مملکت کی پریشان کن اور غمزدہ فضا، جو کہ اموی حکمرانوں کی قدرت طلبی اور استبداد کا نتیجہ تھی، فقر، جنگ اور بیماریاں بھی بے آسرا لوگوں کے سروں پر بجلی بن کر گر رہی تھیں اور انہیں جلا کر راکھ کر رہی تھیں۔ اس فضا میں فضیلت، تقویٰ، اخلاق اور معنویت کے پودے کی پرورش بظاہر ایک محال و مشکل ترین کاموں میں شمار ہوتی تھی۔ علمائے دین، قضات، محدثین اور مفسرین جنہیں بے نوا اور مظلوم عوام کے لیے جائے پناہ ہونا چاہیے تھا، وہ نہ صرف ان کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں اقدام نہیں کرتے تھے بلکہ اکثر خود بھی ایک طرح سے اور بسا اوقات سیاسی شخصیات سے بھی زیادہ خطرناک انداز میں مشکلات میں اضافہ کر رہے تھے۔ فقہ، کلام، حدیث اور تصوف کی نامور اور مشہور شخصیات جیسے حسن بصری، قتادہ بن دعامہ، محمد بن شہاب زہری، ابن بشر، محمد بن المنکدر، ابن ابی لیلیٰ اور ان جیسے دسیوں افراد درحقیقت دربار خلافت کے مہرے یا اُمرا اور فرمانرواؤں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتے تھے۔

افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان باوقار اور نامور شخصیات کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ مطالعہ کرنے والے کے سامنے اپنی غلیظ تمناؤں میں غرق، قدرت طلب، نام و نمود کے شیدائی، لذتوں کے طلب گار یا بزدل، پست اور عافیت طلب بے بس، ریاکار و بے وقوف زہاد یا علم کلام اور اعتقاد کے خونی مباحث میں سرگرم عالم نما افراد کے طور پر مجسم ہوتے ہیں۔ (۱)

۱۔ ان حضرات کی ذلت آمیز خیانت سے آلودہ اور ساتھ ہی احمقانہ موقفوں کے ہزاروں نمونوں میں سے ایک نمونہ یہ ہے: احسن بصری، حجاج بن یوسف (جیسے خون آشام ظالم اور بے نمازی طاغوت) کے خلاف جہاد کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس عمل کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ میری رائے یہ ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

قرآن اور حدیث، جسے علم و معرفت اور نیک خصلتوں کو زندہ رکھنا اور ان کی پرورش کرنی چاہیے تھی، وہ طاقتور لوگوں کے ہاتھوں میں ایک آلۂ کار اور برباد کر دینے والے لوگوں کے لیے ایک بے ثمر مشغولیت بن گئے تھے۔

امامت، دو حیات بخش تحریکوں کا سرچشمہ

اس زہر آلود، تاریک اور گھٹن زدہ فضا میں اور بلاؤں سے پُر اور دشوار زمانے میں امام جعفر صادقؑ نے امانتِ الٰہی کا بارِ گراں اپنے کاندھوں پر سنبھالا۔۔۔۔ اور ایک پریشان حال، فریب خوردہ، مظلوم اور بے شعور امت کے لیے ایسے مظالم اور بلاؤں سے پُر زمانے میں واقعاً "امامت" اس درست مفہوم میں جو شیعی ثقافت میں ایک جانا پہچانا مفہوم ہے، کس قدر ضروری اور حیات بخش ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ امامت، دو حیات بخش تحریکوں کا سرچشمہ ہے، ایک درست اسلامی فکر اور دوسرا عادلانہ توحیدی نظام۔ امامؑ پر یہ دو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں: پہلی ذمہ داری مکتب کی تشریح، تطبیق اور تفسیر (کہ جس میں تحریفات اور جاہلانہ اور مفاد پرستی پر مبنی خیانت سے مقابلہ بھی شامل ہے) اور اس کے بعد عدل و انصاف پر مبنی توحیدی نظام کا قیام (اس نظام کی موجودگی کی صورت میں اسے دوام بخشنا)۔

اب ان پُر آشوب حالات میں امامؑ اس امانت کا بار اپنے کاندھوں پر لیتے ہیں اور ان دو ذمے داریوں کو اٹھاتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں دونوں فریضے امامؑ کے سامنے تھے، ان میں سے پہلے آپؑ کس کے لیے اقدام کریں گے؟

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) کہ اس سے نہ الجھو، کیونکہ اگر وہ تم پر خدا کا مسلط کردہ عذاب ہے تو تم میں اتنی طاقت نہیں کہ خدائی عذاب کو اپنی تلوار سے دور کر سکو اور اگر وہ تم پر نازل ہونے والی بلا ہے تو صبر کر دتا کہ خدا خود حکم کرے کہ وہ بہترین حکم کرنے والا ہے۔" (طبقات ابن سعد۔ ج ۱۔ ص ۱۱۹ منقل از نظریۃ الامامہ محمود صبحی۔ ص ۴۳)

سیاسی عمل پر فکری کام کی ترجیح

درست ہے کہ سیاسی کام میں دشواریاں ہوا کرتی ہیں اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ اموی خلیفہ ہشام اپنی تمام تر مصروفیات اور تنازعات کے باوجود انہیں [امامؑ کو] ان کاموں کے لیے آزاد چھوڑ دے اور اُن سے سخت انتقام نہ لے۔

لیکن فکری کام (تحریفات کے خلاف جنگ) درحقیقت مرکزِ خلافت کی شہ رگ کاٹنا ہے' وہ مرکز جس کے پاس انحرافی دین کا سہارا لینے کے سوا اپنی بقا اور وجود کا کوئی امکان نہیں۔(۱) پس اس سلسلے میں بھی انہیں اجازت نہیں دی' نہ ہشام نے اور نہ ہی علمائے عامہ نے' وہ علما جو عمومی اور معاشرے میں رائج منحرف روش پر گامزن تھے اور اسی پر بھرپور طریقے سے سرگرم تھے۔

دوسری طرف دیکھیں تو شیعہ انقلابی فکر کے پھیلاؤ کے لیے حالات سازگار ہیں: جنگ بھی ہے اور فقر و استبداد بھی' کسی انقلاب کو پیدا کرنے والے یہ تین عامل ہیں۔ اور پس منظر میں دیکھیں تو گزشتہ امامؑ نے نہ صرف قریبی علاقوں بلکہ دور دراز واقع علاقوں میں بھی حالات کو کسی حد تک سازگار بنا دیا ہے۔

۱۔ یہ نکتہ غور و فکر اور انتہائی گہرائی کے ساتھ جائزہ لینے کے قابل ہے کہ درست اسلامی طرزِ فکر سے اسلامی معاشرے کے انحراف کے باوجود عام افراد حتیٰ کہ بہت سے سرداروں اور عمائدین کے ذہن میں دین کی عقیدت اس قدر پختہ تھی کہ یہ ان کے عمل اور زندگی میں حساس کردار کا مالک تھا۔ اسی عمومی عقیدے (جو بدقسمتی سے اسلام کے نام پر گھڑے ہوئے ایک عقیدے پر یقین تھا نہ کہ سچے اسلام پر ایمان) ہی کے بل پر مرکزِ خلافت اپنی ذلت آمیز زندگی کو محفوظ رکھے ہوئے تھا۔ دینی عقائد کی اس پابندی کی ایک مثال کا مطالعہ "بیعت کے مسئلے" میں کیا جاسکتا ہے جو بخوبی حکمرانوں کے کام آرہا تھا۔ کتنے ہی افراد ایسے تھے جو اس عہد کے احترام میں اور یہ دیکھتے ہوئے کہ عہد کو (بالخصوص عہدِ بیعت کو) توڑنا حرام ہے' خلیفہ کے تمام انحرافات دیکھنے کے باوجود اس سے کی ہوئی بیعت کی پاسداری کرتے اور اس کے فرمان سے روگردانی نہیں کرتے تھے۔ اور کتنے ہی مواقع ہیں کہ "وصیت" اور "بیعت" نے نظامِ خلافت کے باقی رہنے کے امکان میں اپنا کردار ادا کیا اور ایک سیاسی گروہ کی جدوجہد میں رکاوٹ بنا۔

امام صادقؑ کی کلی حکمت عملی

امامت کی مجموعی حکمتِ عملی ایک توحیدی اور علوی انقلاب پیدا کرنا ہے' ایک ایسی فضا میں کہ جہاں لوگوں کا ایک لازمی گروہ ہو جو امامت کے نظریے کو جانتا اور اسے قبول کرتا ہو اور اس کے جامہ عمل پہننے کا شوق و اشتیاق سے انتظار کر رہا ہو اور ایک دوسرا لازم گروہ جو عزمِ صمیم کی مالک مبارزاتی تنظیموں سے پیوستہ ہو۔

اس عمومی پالیسی کا منطقی لازمہ پورے عالمِ اسلام میں ایک ہمہ گیر دعوت ہے جس کا مقصد ہر سطح کے لوگوں کے لیے شیعی فکر قبول کرنے کی آمادگی پیدا کرنے کے لیے فضا سازگار کرنا ہے اور ایک فعال دعوت ہے شیعوں کی خفیہ تنظیموں کے لیے فداکار افراد کی تیاری کے لیے۔

دعوتِ امامت کی دشواری

امامت کی سچی دعوت کے کام کی دشواری اسی نکتے میں پوشیدہ ہے۔ ایک مکمل نظریاتی دعوت جب یہ چاہتی ہے کہ حکومت کو ہر قسم کے استبداد' ظلم و تعدی اور عوام کے حقِ آزادی کو پامال کرنے سے باز رکھے اور اسلام کے بنیادی اصولوں اور معیارات کا خیال رکھے' تو اس کے لیے لازم ہے کہ لوگوں کے شعور و ادراک پر تکیہ کرتے ہوئے اور ان کی طبیعی خواہشات کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اپنی نشوونما اور پیش رفت کو جاری رکھے۔

اس کے برعکس ایسی جدوجہد جو ہر چند بظاہر فکری اور مکتبی نعروں کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کرتی ہے' لیکن میدانِ عمل میں معاشرے کے طاقتور لوگوں کی طرح اپنی طاقت و قدرت کا اظہار کرتی ہے اور اپنے اخلاقی و اجتماعی اصولوں کو نظر انداز کر دیتی ہے' انہیں یہ دشواری نہیں ہوتی اور یہی راز ہے امامت کی تحریک کے طولانی ہونے اور تحریکِ امامت کے متوازی چلنے والی تحریکوں (جیسے بنی عباس کی تحریک) کی پیش رفت اور اس کے مقابلے میں اس تحریک کی نسبتاً شکست کا۔ (اس نکتے کو ہم تاریخی مصادر کی بنیاد پر اور زیادہ وضاحت کے ساتھ آئندہ پیش کریں گے)۔

امام صادقؑ مظہر امید صادق

سازگار حالات نیز وہ میدان جو گزشتہ امامؑ کے کام کی وجہ سے فراہم ہو چکا تھا' اس بات کا موجب بنا کہ شیعی تحریک کی طویل اور مشقت بھری راہ کو دیکھتے ہوئے' امام صادقؑ ہی وہ مظہر امید صادق بن گئے جس کے شیعہ سالہا سال سے منتظر تھے۔ وہی "قائم" جو اپنے اسلاف کی طویل جدوجہد کو نتیجے تک پہنچائے گا اور شیعی انقلاب کو پورے عالمِ اسلام کی سطح پر قائم کرے گا۔ امام محمد باقر علیہ السلام کے اشارے اور کبھی کبھی ان کی جانب سے صراحت بھی اس آرزو کی پرورش میں مؤثر واقع ہوئی تھی۔

جابر بن یزید کہتے ہیں کہ کسی شخص نے امام محمد باقر علیہ السلام سے ان کے بعد قیام کرنے والے کے بارے میں پوچھا تو امامؑ نے ابی عبداللہؑ (امام جعفر صادقؑ) کے کاندھے کو تھپتھپایا اور کہا: باخدا یہ ہیں آلِ محمدؐ کے قیام کرنے والے۔(۱)

"قیام کرنے والے" سے کیا مراد ہے؟

قیام کرنے والے سے کیا مراد ہے؟

کیا یہ مراد ہو سکتی ہے کہ "تبلیغ وارشاد واحکامِ دین کے بیان کے لیے قیام"

یا وہ مفہوم جس تعبیر سے ہم آج سمجھتے ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔

ائمہ اور شیعوں کے عرف میں قیام اسی مفہوم کا حامل ہے جو آج اس لفظ سے لیا جاتا ہے۔ قیام کرنے والا اسے کہتے ہیں جو حکمران طاقت کے خلاف مضبوطی کے ساتھ کمربستہ ہو جائے اور اٹھ کھڑا ہو۔ اس کا مطلب لازمی طور پر عسکری طاقت کے اظہار کے ساتھ ہونا نہیں ہے لیکن بہرحال ایک تعارض اور یلغار کی نشاندہی اور ایک بڑے اور بھرپور اقدام کی عکاسی ضرور کرتا ہے' وہ بھی فکری ونظریاتی سرگرمیوں کے میدان میں یا افراد کی تیاری کے اعتبار سے یا ایک تنظیم کی

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۴۷۔ ص ۱۳۱

تشکیل اور ایک خفیہ تحریک کی قیادت کی صورت میں لیکن بہر صورت قہر و تعارض کے ساتھ۔

لہٰذا امام محمد باقر علیہ السلام کے فرمان کے مطابق اس بارے میں کوئی بحث نہیں کہ ان کے فرزند جعفر ابن محمدؑ قیام کریں گے۔ بے شک انہیں اپنی تعارض آمیز تحریک کا آغاز کرنا چاہیے تھا' رہی یہ بات کہ آیا ان کی حرکت و قیام آخری مرحلے (یعنی عسکری اقدام اور آخرکار کامیابی اور اقتدار کے حصول) تک پہنچ پائے گا یا نہیں' یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس کا تعین آئندہ پیش آنے والے واقعات و حوادث اور معاملات کی پیشرفت کی کیفیت سے وابستہ ہے۔۔۔ گویا اسی حوالے سے ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ کی تحریک اور آپؑ کے اقدام کا انجام دو ٹوک لہجے میں نہ سہی' لیکن نا امیدانہ انداز میں ضرور آیا ہے۔ اس روایت میں بھی امام محمد باقر علیہ السلام اپنے ایک نزدیکی صحابی سے مخاطب ہیں۔

ابو صباح کنانی کہتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے فرزند ابی عبداللہؑ کی طرف دیکھا اور فرمایا: تم انہیں دیکھ رہے ہو؟ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں سورۂ قصص کی آیت نمبر ٥ میں خدا نے فرمایا ہے کہ: "ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم زمین کے مستضعف لوگوں پر احسان کریں اور انہیں زمین کا حکمران اور وارث قرار دیں۔"

شاید ان ہی بیانات کا اثر تھا کہ امام جعفر صادقؑ کے قیام اور ان کی خلافت کا نظریہ خاص شیعوں کے درمیان بھی رائج ہو چکا تھا اور امامؑ کے نزدیک ترین اصحاب اور آپؑ کے پدر بزرگوار اس کی نوید حتمی طور پر دیا کرتے تھے۔

نزدیکی اصحاب کی امیدیں

شیخ "کشی" ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس سے نزدیکی اصحاب کی امیدوں کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک شیعہ' مخالفوں کا بہت زیادہ مقروض ہو گیا اور جب ادائیگی نہیں کر پایا تو اپنے قرض خواہ کے سامنے آنے سے گریز کرنے لگا۔ زرارہ' جو کہ شیعوں میں ایک سرفہرست شخصیت ہیں' امامؑ کے پاس آتے ہیں اور سارا ماجرا بیان کرنے کے بعد پوچھتے ہیں: اگر "یہ امر" نزدیک

ہے تو یہ مقروض شخص صبر کرے تاکہ "قائم" کے ساتھ خروج کرے اور اگر اس میں تاخیر ہے تو قرض خواہوں سے مصالحت کا راستہ اختیار کرے۔

جواب میں حضرتؑ صرف اس جملے پر اکتفا کرتے ہیں: [قیام] ہو جائے گا۔

زرارہ پوچھتے ہیں: ایک سال تک۔

آپؑ فرماتے ہیں: انشاءاللہ ہو جائے گا۔

وہ [زرارہ] پوچھتے ہیں: دو سال میں؟

آپؑ فرماتے ہیں: انشاءاللہ ہو جائے گا۔ اور بالآخر زرارہ اسی پر اکتفا کر لیتے ہیں کہ "یہ امر" اگلے دو سال بعد واقع ہو جائے گا۔ (۱)

شیعہ اور ائمہ علیہم السلام کے عرف میں "یہ امر" ایک کنایہ آمیز تعبیر ہے' تشیع کے مستقبل کے موعود کی۔ یعنی سیاسی اقتدار کا حصول یا اسے نزدیک کرنے کے لیے مسلح جدوجہد جیسے اقدامات' اور "قائم" وہ ذات ہے جو اس اقدام کی رہنمائی اور رہبری کرے گا۔ اور ہماری روایات میں ایسے متعدد موارد پائے جاتے ہیں جن میں قائم کے قیام کی خصوصیات کے حوالے سے پیش گوئیاں ہوئی ہیں اور ہر جگہ مقصود وہی قیام کرنے والا ہے۔ ائمہؑ کی پوری حیات کے دوران شیعہ جس کا انتظار کرتے رہے ہیں اور مختلف افراد کے اندر انہیں ڈھونڈتے رہے ہیں۔

ایک اور روایت میں ہشام بن سالم (یہ بھی ایک ممتاز شیعہ ہیں) نقل کرتے ہیں کہ زرارہ نے مجھ سے کہا تھا: "خلافت کے ستونوں پر جعفرؑ کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھو گے"۔ جب ابوعبداللہؑ (امام جعفر صادقؑ) کی شہادت ہوئی' تو میں ان کے پاس گیا اور میں نے انہیں یہ بات یاد دلائی' مجھے اس بات کا خوف تھا کہ وہ اس کا انکار کر دیں کہ انہوں نے مجھ سے ایسی کوئی بات کہی تھی۔ زرارہ نے جواب میں کہا: میں نے وہ بات اپنی رائے اور استنباط کے مطابق کہی تھی۔ (۲)

۱۔ رجال کشی۔ ص ۱۵۸

۲۔ رجال کشی۔ ص ۱۵۶' ۱۵۷

ان بیانات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ امام اپنے پدر عالی مقام کی نظر میں نیز شیعوں کی نگاہ میں امامت اور تشیع کے کامل نمونے (ideals) کا مصداق ہیں۔ گویا سلسلۂ امامت ان کو امام سجاد اور امام محمد باقر علیہم السلام کی کوششوں کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے ایک ذخیرہ سمجھتا رہا تھا۔ گویا وہی ہیں جنھیں حکومت علوی اور نظام توحیدی کا احیا اور اسلام کو دوبارہ سربلند کرنا چاہیے۔ ان سے پہلے کے دو اماموں نے اس دشوار راستے کے ابتدائی مراحل کو طے کرلیا ہے اور اب ان کی باری ہے کہ آخری قدم اٹھائیں۔ اتفاقاً (جیسا کہ اشارہ کیا گیا) حالات بھی سازگار ہیں اور امام مناسب حالات اور صورتحال سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی سنگین ذمے داری کا آغاز کرتے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کے دور کے نشیب وفراز

آپ کی زندگی امامت کے پہلے ہی روز سے اختتامی لمحے تک کے تینتیس (۳۳) سال' جدوجہد اور ثمرات سے پر تھی۔ اس مدت میں نشیب وفراز اور سیاسی واجتماعی تبدیلیوں نے امامؑ اور شیعوں کی زندگی کے حالات کو بار بار تہ وبالا کیا۔ اس پیکار اور پنجہ آزمائی کے دوران شیعوں کا پلڑا کبھی ہلکا اور کبھی بھاری ہونے لگتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوجاتا تھا کہ زیادہ خوش گمان افراد شیعوں کی کامیابی کو انتہائی نزدیک اور دسترس میں دیکھنے لگتے تھے یہاں تک کہ عسکری طاقت کے اظہار کے لیے حالات کی سازگاری میں وہ مبالغہ تک کرنے لگتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوجاتا تھا کہ دباؤ اور گھٹن کا ماحول امامؑ اور ان کے اصحاب کو سانس بھی نہیں لینے دیتا تھا' اور تمام آرزوئیں اور تمنائیں خاک میں ملتی محسوس ہونے لگتی تھیں۔۔۔

امام صادقؑ ان تمام حالات میں ایک ایسے پرعزم آگاہ اور مضبوط راہرو اور رہنما کا کردار ادا کر رہے تھے جو امید ویاس کی سینکڑوں نشانیوں کے درمیان صرف اور صرف چلتے رہنے' طویل راستہ طے کرنے اور ناگزیر مراحل سے گزرنے کے بارے میں سوچتا ہے۔ امامؑ نے اپنے عشق و اخلاص وایمان کی دولت کو ہر حال میں اور ہر زمانے میں اور مناسب انداز میں بے دریغ استعمال کیا اور اپنی الٰہی ذمے داری کے بوجھ کو منزلِ مقصود سے قریب تر کیا۔

امام صادقؑ کے حالاتِ زندگی کے گرد ابہامات کا سایہ

یہاں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کی زندگی پر تحقیق کرنے والے افراد کے ساتھ پیش آنے والی ایک افسوس ناک ترین چیز کی جانب اشارہ کر دیا جائے اور وہ یہ ہے کہ امامؑ کی زندگی کے حالات بالخصوص آپؑ کی امامت کے ابتدائی سال جو بنوامیہ کی حکومت کے آخری برسوں میں بسر ہوئے ان پر ابہامات کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ مختلف قسم کے واقعات وحوادث سے بھرپور زندگی جس میں موجود کشمکش اور نشیب وفراز کو تاریخ کی سینکڑوں روایات کے درمیان دیکھا جاسکتا ہے' یہ نہ تو تاریخ میں اور نہ محدثین اور تذکرہ نویسوں کے کلام میں کسی مرتب اور باہم مربوط شکل میں سامنے آئی ہے۔ اس میں پیش آنے والے زیادہ تر حوادث کا زمانہ اور ان کی خصوصیات کا تعین نہیں ہوا ہے۔ تحقیق کرنے والوں پر لازم ہے کہ قرائن کی بنیاد پر اور اس زمانے کے مجموعی حالات کے مطالعے اور ہر روایت کا موازنہ ان معلومات کے ساتھ کر کے جو اس روایت میں مذکور افراد کے بارے میں دوسری کتابوں میں موجود ہیں' کسی حادثے کے زمان ومکان اور خصوصیات کو دریافت کرے۔ شاید اس ابہام کو اور بالخصوص امامؑ کی اپنے اصحاب کے ساتھ تنظیمی سرگرمیوں میں موجود ابہام کو خود اس کام کی حقیقت میں تلاش کرنا چاہیے۔

مخفی اور تنظیمی کام

خفیہ اور تنظیمی عمل کو معمول کے طور پر پوشیدہ عمل کے درست اصولوں کے مطابق ہمیشہ خفیہ رہنا چاہیے۔ اُس زمانے میں بھی [وہ] مخفی تھا اس کے بعد بھی مخفی رہے گا اور اس عمل کو انجام دینے والے افراد کی رازداری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی اجنبی اس سے واقف ہو سکے۔ جب بھی وہ عمل اپنے نتیجہ تک پہنچے گا اور اس کی قیادت کرنے والے اور ماتحت افراد اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے تو خود ہی اپنے خفیہ عمل کی باریکیوں کا اظہار کر دیں گے۔ اسی وجہ سے اب عباسی دور کی بہت سی باریکیاں حتیٰ کہ بنوعباس کے سرداروں کے خصوصی احکامات اور اپنے تنظیمی ماتحتوں

کے ساتھ ان کے خفیہ روابط' تاریخ میں ثبت ہیں اور سب ان سے آگاہ ہیں۔

بے شک اگر علوی تحریک بھی کامیابی سے ہم کنار ہوتی اور ائمہ شیعہ یا ان کے منتخب شدہ افراد کے ہاتھ میں قدرت اور حکومت کا اختیار آ جاتا تو ہم آج علوی دعوت کے تمام سربستہ رازوں اور ان کی ہر طرف پھیلی ہوئی اور انتہائی خفیہ تنظیموں کے تمام رازوں سے مطلع ہوتے۔

تاریخ نویسی کی خصوصیت

دوسری وجہ کو تاریخ نویسوں کی خصوصیات میں تلاش کرنا چاہیے۔ باضابطہ لکھی جانے والی تاریخ میں اگر کسی محکوم اور مظلوم گروہ کا محض نام بھی باقی ہو اور اس کا کوئی واقعہ بھی درج ہو' تو بے شک اسی انداز سے ہو گا جس طرح حاکم اور ظالم گروہ نے اس کی خواہش ظاہر کی ہو گی یا اس کے بارے میں کہا ہو گا یا جس طرح سے اس کو ظاہر کیا ہو گا۔ ایک حکومتی تاریخ نویس مظلوم اور محکوم گروہ کے بارے میں دل آزار باتوں کے سوا اگر کچھ اور بیان کرے گا تو اسے یہاں وہاں سے بہت سعی و کوشش کے بعد کچھ ہاتھ آئے گا اور وہ اسے خوف کے ساتھ لکھے گا۔ جب کہ حکمرانوں کے حوالے سے بہت ساری خبریں اور ان کا کلام موجود ہوتا ہے جو بغیر کسی زحمت اور بغیر کسی خوف کے تحریر کیا جا سکتا ہے' اس کی مزدوری بھی وصول کی جا سکتی ہے اور کوئی خطرہ بھی نہیں ہوتا۔

تاریخ نویسی کا عباسی انداز

اب اس روشن حقیقت کو ہم ایک دوسری حقیقت کے پہلو میں رکھتے ہیں۔ تمام معروف اور معتبر تاریخیں جو بعد کی اکثر تحقیقات اور بیانات کا مدرک اور ماخذ شمار ہوتی ہیں اور جو امام صادقؑ کی شہادت کے پانچ سو سال بعد تک لکھی گئی ہیں' ان میں عباسی رنگ پایا جاتا ہے۔ کیونکہ' جیسا کہ ہم جانتے ہیں' عباسیوں کی حکومت ساتویں صدی ہجری کے وسط تک جاری رہی اور تمام قدیم اور مشہور تاریخیں اسی اقتدار اور سلطنت کے سنگدلانہ دور میں لکھی گئی ہیں۔ اور اس صورتحال کے پیش نظر' نتیجے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عباسی دور کے کسی مورخ سے کسی بھی صورت میں یہ توقع نہیں کی

جا سکتی کہ وہ امام جعفر صادقؑ یا کسی بھی دوسرے شیعہ امام کی زندگی کے بارے میں درست اور منظم معلومات حاصل کر کے اپنی کتاب میں درج کرنا چاہے گا یا کر سکے گا۔ یہ ہے امام جعفر صادقؑ کی زندگی میں بہت سی تحریفات اور ابہامات کا راز۔

امام جعفر صادقؑ کی زندگی سے آشنائی کا راستہ

واحد راستہ جو ہمیں امام جعفر صادقؑ کی مجموعی زندگی کی روش سے آگاہ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان بہت سے ابہامات کے درمیان سے امامؑ کی زندگی کے اہم ترین مظاہر کو تلاش کریں۔ امامؑ کے تفکر اور اخلاق کے کلی اصولوں کی مدد سے جنہیں ہم جانتے ہیں امامؑ کی زندگی کی بنیادی روش کی تصویر کشی کریں۔ اور پھر خصوصیات اور باریکیوں کے تعین کے لیے تاریخ کے بکھرے ہوئے قرائن و دلائل نیز غیر تاریخی قرائن کا انتظار کریں۔

امام صادقؑ کی زندگی کے اہم مظاہر

امام جعفر صادقؑ کی زندگی کے اہم ترین اور نمایاں مظاہر کو اس نقطۂ نظر کے تحت جو ہماری بحث سے مربوط ہے ہم نے اس طرح پایا ہے:

۱۔ فلسفۂ امامت کی تشریح و تبلیغ

۲۔ شیعی فقہ کے نقطۂ نظر سے دین کے احکامات کی تبلیغ اور انہیں بیان کرنا نیز شیعی نظریے کے مطابق تفسیر قرآن۔

۳۔ سیاسی اور نظریاتی (ideological) خفیہ تنظیموں کا وجود۔

۱۔ مسئلہ امامت کی تشریح و تبلیغ

شیعہ اماموں کی دعوت کی نمایاں ترین خصوصیت

ہمیں اس موضوع کو ائمہ شیعہ کی دعوت کی نمایاں ترین خصوصیت سمجھنا چاہیے۔ پیغمبر اکرمؐ

کی رحلت کے بعد کے اولین برسوں سے امامت کے تمام ادوار میں شیعی دعوت کا سرفہرست مسئلہ اہلِ بیتِ پیغمبرؐ کی امامت کا اثبات تھا۔ یہ موضوع امام حسین ابن علیؑ کے خونی قیام میں بلکہ اس کے بعد زید بن علی جیسے فرزندانِ امامؑ کی تحریکوں میں بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ کی دعوت بھی اس اصول سے باہر نہیں تھی۔

اسلامی تعلیمات میں امامت کا مفہوم

اس موضوع کے اسناد و مدارک پیش کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات میں "امامت" کا مفہوم کیا ہے اور امامت کی طرف دعوت کے کیا معنی ہیں۔ "تبلیغِ امامت" کا حقیقی مضمون اسی صورت میں سمجھ میں آئے گا جب ہم "امامت" کا مفہوم جانتے ہوں۔

امامت (جس کے معنی دراصل مطلق پیشوائی کے ہیں) کے لفظ کا اطلاق اسلامی تعلیمات میں زیادہ تر ایک خاص مصداق پر ہوتا ہے، اور وہ اجتماعی میدان میں فکری و سیاسی پیشوائی اور رہبری کے ہیں۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی (امام اور ائمہ کی مانند) لفظ امامت کے مشتقات کا استعمال ہوا ہے، اس میں اسی خاص معنی کو مدنظر رکھا گیا ہے یعنی "امت کی قیادت و رہبری" فکری قیادت یا سیاسی قیادت یا دونوں۔ رسولِ اکرمؐ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے درمیان فکری و سیاسی دھڑے بندیاں جن کا انجام پیروانِ اسلام کے کئی فرقوں میں بٹ جانے پر منتج ہوا۔ چونکہ اس کا اصل نقطۂ اختلاف امت کی سیاسی رہبری کا مسئلہ تھا، لہٰذا امامت اور امام کی اصطلاح ایک خاص اہمیت اختیار کر گئی اور دوسرے تمام معانی سے زیادہ "سیاسی رہبری" کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا اور رفتہ رفتہ دوسرے معنی اس معنی کے زیر اثر آگئے۔ یہاں تک کہ جب دوسری صدی ہجری میں ایک کے بعد دوسرا اسلام کا کلامی مکتب وجود میں آیا اور مختلف اسلامی افکار و خیالات، نظریاتی اور مکتبی سرحدوں میں نمایاں ہو گئے تو ان تمام مکاتب کے اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ امامت کا ہوا کرتا تھا، جس کے معنی سیاسی قیادت و رہبری تھی۔ اس مسئلہ میں عام طور پر امام (یعنی معاشرہ پر حاکم اور اس کی باگ ڈور سنبھالنے والے شخص) کی شرائط و خصوصیات کے بارے

میں گفتگو کی جاتی تھی اور اس بارے میں ہر گروہ اپنا ایک خاص عقیدہ اور نقطۂ نظر رکھتا تھا۔

مکتبِ تشیع میں امامت کا مفہوم

مکتب تشیع (جو کہ اپنے پیروکاروں کے لحاظ سے فکر اسلامی کا خالص ترین سلسلہ ہے) میں بھی امامت سے یہی معنی اخذ کیے جاتے تھے۔ امامت کے بارے میں اس مکتب کے نظریے کو اس طرح خلاصہ کیا جا سکتا ہے کہ: اسلامی معاشرے کا قائد اور حکمران خدا کی جانب سے معین ہونا اور پیغمبرؐ کی طرف سے اس کا تعارف کرایا جانا چاہیے' اسے فکری رہنما' مفسر قرآن اور دین کے تمام رموز اور باریکیوں سے آگاہ ہونا چاہیے' اسے خَلقی و خُلقی اور نسبی لحاظ سے ہر عیب و نقص سے مبرا اور پاک و معصوم ہونا چاہیے اور اس کی ولادت پاکیزہ خاندان میں ہونی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ اور اس طرح سے امامت جو کہ پہلی اور دوسری صدی کے مسلمانوں کی نظر میں سیاسی رہبری کے معنی میں تھی' وہ شیعوں کے خاص نقطۂ نظر میں سیاسی رہبری کے علاوہ فکری و اخلاق رہبری کو بھی اپنے مفہوم میں رکھتی تھی۔

جب شیعہ کسی کو امام کے طور پر جانتے تھے تو نہ صرف سیاسی و اجتماعی امور کے انتظام و انصرام بلکہ اس سے فکری رہنمائی' دینی تعلیم اور اخلاقی تزکیہ کی بھی توقع رکھتے تھے۔ اور اگر یہ ذمے داریاں اس کے لیے ممکن نہیں ہوتی تھیں تو اسے "برحق امام" نہیں سمجھتے تھے اور اچھا سیاسی نظم و ضبط' عسکری طاقت کا مظاہرہ' جنگ و جدل اور کشور کشائی (جو دوسروں کی نظر میں کافی معیارات شمار کیے جاتے تھے) شیعہ صرف ان ہی پر قناعت نہیں کرتے تھے۔

شیعوں کی نظر میں امامت کے مفہوم کی بنا پر کسی معاشرے کا امام وہ بالاتر قوت ہے جو اس معاشرے کی اجتماعی اور انفرادی حرکت کی وضاحت اور رہنمائی کرتا ہے اور ایک ہی وقت میں وہ دین و اخلاق کا معلم بھی ہوتا ہے اور ان کی روزمرہ کی زندگی اور جدوجہد کا فرمانروا بھی۔ اس بیان کی روشنی میں پیغمبرؐ بھی امام ہیں کیونکہ وہ معاشرہ' جس کی خود انہوں نے بنیاد رکھی' اس کی فکری و سیاسی رہبری بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ اور پیغمبرؐ کے بعد بھی امت کو ایک امام کی ضرورت ہے تاکہ

ان کا جانشین (خلیفہ) اور اُن کی ذمے داریوں (جن میں سیاسی قیادت بھی شامل ہے) کو اٹھانے والا بن سکے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ یہ جانشینی پیغمبرؐ کی تصریح کے مطابق امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ اور ان کے بعد اُن کے خاندان کے معصوم ائمہؑ کے لیے ہے۔(۱)

امام کا تعین خدا کی طرف سے ہونا چاہیے

یہ نکتہ قابلِ بیان ہے کہ اسلامی حکومت اور خلافت میں سیاسی قیادت، دینی تعلیم اور روحانی تزکیہ کی باہم آمیزش (جس نے اسلام کی امامت اور حکومت کو تین پہلوؤں اور تین ابعاد کا حامل قرار دیا ہے، جسے عصرِ حاضر کے بعض ممتاز مفکرین نے بہت اچھے طریقے سے بیان کیا ہے) کی بنیاد یہ ہے کہ اسلام نے دراصل ان تین پہلوؤں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا ہے اور ایک واحد پروگرام ان تین جہات میں انسان کے سامنے آیا ہے۔ پس امت کی امامت کے معنی بھی ان تین جہات میں قیادت ہے اور امامت کے معنی کی اسی وسعت کی بنا پر شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امام کا تعین خدا کی طرف سے ہونا چاہیے۔

امام سربراہِ حکومت اور آئیڈیالوجسٹ (ideologist)

نتیجہ یہ کہ سطحی نظر سے دیکھنے والوں کے برخلاف، جنہوں نے "امامت" کو "خلافت" اور "حکومت" جیسی چیز تصور کیا ہے اور اسے صرف ایک معنوی، روحانی اور فکری منصب شمار کیا ہے، شیعی تعلیمات میں امام "رہبرِ امت" ہے۔

دنیاوی امور اور لوگوں کی زندگی کے نظم ونسق اور معاشرے کی سیاسی و اجتماعی تدبیر کے حوالے سے بھی (= سربراہِ حکومت) اور معنوی وروحانی تعلیم وہدایت، فکری مشکلات کے حل اور آئیڈیالوجی (ideology) کی تشریح اور وضاحت کے عنوان سے بھی (= آئیڈیالوجسٹ)۔

۱۔ اس کی تفصیل اور استدلال کے لیے اس سے مربوط کتب کا مطالعہ کیجیے۔

یہ واضح نکتہ امامت کے اکثر معتقدین کے ذہنوں میں ایسا اجنبی بن چکا ہے کہ اس بارے میں موجود سینکڑوں قرآنی و حدیثی مدارک میں سے چند نمونوں کا ذکر غیر ضروری دکھائی نہیں دیتا۔

روایات میں امامت کا مفہوم

کافی کی کتاب "الحجت" میں حضرت علی ابن موسیٰ الرضاؑ سے امام کی شناخت اور اس کے اوصاف کے بارے میں ایک مفصل حدیث نقل ہوئی ہے۔ جس میں امامؑ کی پُر معنی اور قابلِ توجہ خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ جیسا کہ امامت کے بارے میں کہا گیا ہے:

"دین سے تعلق' مسلمانوں کا نظم و نسق' دنیا کی آبادی' مومنین کی سربلندی' پیغمبروں کا رتبہ' جانشینوں کی میراث' خلافتِ الٰہیہ اور جانشینِ پیغمبرؐ۔"

اور امام کے بارے میں کہا گیا ہے:

"معاشرے میں مال و دولت میں اضافہ کرنے والا' حدود اور احکامِ الٰہی کا جاری کرنے والا' سرحدوں کا محافظ' مخلوق کے درمیان اللہ کا امین' مینارۂ نور' راہِ خدا میں دعوت دینے والا' حریمِ الٰہی کا مدافع' منافقین کو غضب ناک کرنے والا' کافروں کی بنیادیں ہلا دینے والا' مومنین کو عزت دینے والا' تجربہ کار اور ماہر حکمران' سیاست کو سمجھنے والا' فرمانِ الٰہی کی انجام دہی کے لیے کمر بستہ' بندگانِ الٰہی کا خیر خواہ' دینِ الٰہی کا نگہبان وغیرہ۔"(۱)

ایک دوسری روایت میں جو امام جعفر صادقؑ سے نقل کی گئی ہے' صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ پیغمبرؐ کو حاصل تمام امتیازات اور تمام عہد و پیمان کے امیر المومنینؑ اور دیگر ائمہؑ حامل تھے(۲)

امام جعفر صادقؑ سے ہی نقل شدہ ایک دوسری روایت میں "اوصیاء" کی فرمانبرداری کے واجب ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد وضاحت کی گئی ہے کہ اوصیاء وہ لوگ ہیں

۱۔کافی۔ج۱۔ص۱۹۸

۲۔جَرٰی لَهُ مِنَ الْفَضْلِ مَا جَرٰی لِمُحَمَّدٍ۔۔۔۔وَلَقَدْ حُمِلْتُ عَلٰی مِثْلِ حُمُوْلَتِهِ۔۔۔۔وَ کَذٰلِكَ یَجْرِی الْاَئِمَّةُ الْهُدٰی وَاحِداً بَعْدَ وَاحِدٍ۔کافی۔ج۱۔ص۱۸۹

جنھیں قرآن میں "اُوْلُوا الْاَمْرِ" کی تعبیر سے یاد کیا گیا ہے۔(۱)

مختلف کتابوں کے متعدد ابواب میں بکھری سینکڑوں روایات میں صراحت کے ساتھ امام اور امامت کو شیعی نظریہ کی رو سے "حکمرانی" اور "امتِ مسلمہ کے معاملات کو چلانے والا" اور ائمہ اہل بیتؑ کو حکومت کا سچا وارث قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ انصاف پسند محقق کے سامنے شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ائمہ اہل بیتؑ کی طرف سے امامت کا دعویٰ، فکری و روحانی مقام سے ماوراحقِ حکومت کا دعویٰ بھی ہے اور ان کی وسیع دعوت درحقیقت حکومت کے حصول کے لیے سیاسی اور عسکری مبارزہ کی دعوت ہے۔

یہ نکتہ جو بعد کے سینکڑوں مولفوں اور محققوں کی آنکھوں سے پوشیدہ رہا (۲) خود ان حضراتؑ کے زمانے کے مسلمانوں کی نظر میں واضح ترین حقائق میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ مشہور و معروف، انتہائی ہنرمند عرب شاعر، ایک معروف ترین شیعی شخصیت اور شدید علوی رجحانات کی وجہ سے شہید ہونے والا شاعر کمیت، اپنے متعدد قصیدوں میں سے ایک معروف قصیدہ میں ائمہ اہل بیتؑ کی توصیف کرتے ہوئے انہیں ایسا سیاست دان قرار دیتا ہے جو اس زمانے میں مسلط شدہ حکمرانوں کے برخلاف انسانوں کی سرپرستی اور ان پر حکمرانی کو مویشیوں کی گلہ بانی کی مانند نہیں بناتے۔ (۳)

امام جعفر صادقؑ کا امامت کی طرف بلانا

اب ہم اصل بات کی طرف پلٹتے ہیں یعنی دوسرے ائمہؑ کی مانند امام صادقؑ نے بھی اپنی

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۱۸۹

۲۔ نمونہ کے لیے ان متعدد کتابوں کا مطالعہ کیجیے جو گزشتہ عشروں میں مستشرقین نیز شیعہ و سنی مسلمان مصنفوں کی جانب سے لکھی گئی ہیں اور ان میں بغیر کسی استثناء کے مسئلہ حکومت کے مقابل ائمہؑ کے کردار کو منفی لاتعلق یا حتیٰ کہ موافقت پر مبنی قرار دیا گیا ہے بلکہ سیاست سے بکسر دور پیش کیا گیا ہے، جیسے "نظریہ الامامۃ لدی الشیعۃ" "التشیع و التصوف" "الامام الصادق و المذاهب الاربعۃ" "العباسیون الاوائل"

۳۔ سیاسۃ لا کمن یری رعیۃ الناس سوء و رعیۃ الانعام

دعوت کا نمایاں محور امامت کے موضوع کو قرار دیا تھا۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے واضح ترین ثبوت وہ کثیر روایات ہیں جو امامؑ کی زبانی امامت کے دعوی کو پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔

جیسا کہ ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے' امامؑ اس نکتے کی تبلیغ اور اشاعت کے موقع پر اپنے آپ کو جدوجہد کے ایک ایسے مرحلہ میں دیکھتے تھے کہ براہ راست اور صراحت کے ساتھ حکمرانِ وقت کی نفی کریں اور لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو ولایت اور امامت کے حقیقی حقدار کے طور پر متعارف کرائیں۔ اور قاعدے سے یہ عمل فقط اسی وقت انجام پاتا ہے جب مبارزہ کے تمام گزشتہ مراحل کامیابی کے ساتھ طے کر لیے گئے ہوں۔ چنانچہ ایک وسیع طبقے میں سیاسی اور اجتماعی شعور پیدا ہو گیا ہو' ہر جگہ بالقوہ (Potentially) آمادگی کا احساس ہوتا ہو' نظریاتی میدان میں ایک قابل توجہ گروہ پیدا ہو چکا ہو' حق اور عدل کی حکومت کا لازمی ہونا ایک کثیر تعداد کے لیے ثابت ہو چکا ہو اور بالآخر یہ کہ رہبر نے آخری جنگ کے لیے مصمم ارادہ کر لیا ہو۔ ان تمام باتوں کے بغیر معاشرے کے لیے ایک برحق امام اور حکمران کے طور پر ایک معین شخص کا نام پیش کرنا جلد بازی پر مبنی اور بے فائدہ کام ہوگا۔

امامت کا اٹوٹ سلسلہ

ایک اور نکتہ جس پر توجہ دی جانی چاہیے وہ یہ ہے کہ مختلف مواقع پر امامؑ اس بات پر اکتفا نہیں کرتے کہ امامت کو صرف اپنے لیے ثابت کریں بلکہ اپنے نام کے ساتھ ساتھ ائمہؑ برحق اور اپنے گزشتہ اسلاف کا بھی ذکر کیا کرتے تھے اور در حقیقت اہل بیتؑ کی امامت کے سلسلے کو متصل اور ناقابل جدائی انداز سے پیش کیا کرتے تھے۔ یہ عمل اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ شیعی فکر تمام گزشتہ غیر مستحق حکمرانوں کی مذمت کیا کرتی تھی اور انہیں طاغوت قرار دیتی تھی' اس زمانے کے شیعوں کے جہاد کو گزشتہ زمانے کے جہاد کے ساتھ پیوستہ ہونے کی جانب اشارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ در حقیقت امام صادقؑ اس بیان کے ذریعے اپنی امامت کو ایک لازمی نتیجے کے طور پر شمار

کرتے ہیں جو گزشتہ ائمہ کی امامت پر مترتب ہے اور اسے بے بنیاد اور بے اساس ہونے کی حالت سے باہر نکالتے ہیں اور اپنے سلسلے کو ایک قابل اطمینان اور نا قابل شک وتردید زنجیر کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ سے متصل کر دیتے ہیں۔ آیئے اب امامؑ کی دعوت کے چند نمونوں کو ملاحظہ کرتے ہیں۔

ایک حیرت ناک منظر کی تصویر کشی

خوبصورت ترین روایت جو میں نے اس باب میں دیکھی' وہ ''عمرو بن ابی المقدام'' کی روایت ہے جو ایک حیرت انگیز منظر کی تصویر کشی کرتی ہے: نویں ذی الحجہ (عرفہ کا روز) ہے' عرفات میں ایک جم غفیر اس دن کے مخصوص اعمال کی ادائیگی کے لیے جمع ہوا ہے اور خراسان کے دور دراز علاقوں سے لے کر بحیرۂ روم (Mediterrnean Sea) کے ساحل تک کے تمام مسلمان نشین علاقوں کے مقامی نمائندے موجود ہیں۔

یہاں پر ادا کیے گئے برحق کلام کا ایک جملہ اُس زمانے میں وسیع ترین ذریعۂ ابلاغ کا کام کر سکتا تھا۔ امامؑ خود اس مجمع میں تشریف لے جاتے ہیں اور ایک پیغام دیتے ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ: میں نے دیکھا کہ امامؑ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے اور بلند آواز (ایسی بلند آواز جو ہر جگہ اور ہر کان میں گونجتی ہے اور سننے والوں کے ذریعے پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے) سے اپنا پیغام تین مرتبہ دہراتے ہیں۔ اس کے بعد اپنا چہرہ دوسری سمت پھیرتے ہیں اور پھر وہی پیغام ۔۔۔ اور اس طرح امامؑ بارہ مرتبہ اپنا کلام دہراتے ہیں۔ اس پیغام کے الفاظ یہ تھے:

''أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَسُولَ اللهِ كَانَ الْإِمَامَ، ثُمَّ كَانَ عَلِيَّ ابْنَ أَبِي طَالِبٍ، ثُمَّ الْحَسَنَ، ثُمَّ الْحُسَيْنَ، ثُمَّ عَلِيَّ ابْنَ الْحُسَيْنِ، ثُمَّ مُحَمَّدَ ابْنَ عَلِيٍّ، ثُمَّ ۔۔۔''(۱)

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۴۷۔ ص ۵۸

ائمہ شیعہ کے اوصاف بیان کرنا

ایک اور روایت ابی الصباح کنانی سے منقول ہے جس میں امام صادقؑ خود اپنے اور دوسرے ائمہ شیعہ کے اوصاف اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ہم وہ ہیں کہ خدا نے ہماری اطاعت کو لوگوں پر واجب کیا ہے۔ انفال اور صفو المال ہمارے اختیار میں ہے۔''

صفو المال' اس انتخاب شدہ مال کو کہتے ہیں جسے سرکش طاغوت اپنے لیے مخصوص کر لیتے ہیں اور مستحق افراد کی رسائی سے دور رکھتے ہیں اور جب یہ غصب شدہ اموال مسلمان مجاہدین کی کامیابی کے بعد ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے تو دوسرے مالِ غنیمت کی طرح تقسیم نہیں ہوتا کہ کسی ایک فرد کے اختیار میں آ جائے اور اسے جھوٹی شان و شوکت اور تفاخر بخش دے بلکہ اسے حاکمِ اسلامی کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور وہ اسے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد میں استعمال کرتا ہے۔ اس روایت میں امامؑ اپنے آپ کو صفو المال اور انفال (کہ جس کا تعلق بھی امامؑ سے ہے) کے مختار کے طور پر متعارف کرواتے ہیں اور اس طرح وضاحت کے ساتھ یہ پیغام دیتے ہیں کہ آج اسلامی معاشرے کے حاکم وہ ہیں اور یہ سب چیزیں ان کے ہاتھ اور ان کے اختیار میں ہونی چاہئیں اور ان کے زیرِ نظر درست مصارف میں ان کا استعمال ہونا چاہیے۔

علم اور حکومت کے وارث

امام علیہ السلام ایک اور حدیث میں ایک ایک کر کے گزشتہ ائمہؑ کے نام لیتے ہیں اور ان کی امامت کی اور ان کے فرمان کی اطاعت کے واجب و لازم ہونے کی شہادت دیتے ہیں اور جب اپنے نام تک پہنچتے ہیں تو خاموش ہو جاتے ہیں۔ امام کا کلام سننے والے لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام کے بعد علم و حکمت کی میراث امام صادقؑ کے اختیار میں ہے۔ اور اس طرح سے آپؑ اپنا حقِ حکمرانی بھی سامنے لاتے ہیں اور استدلالی لہجہ اختیار کرتے ہوئے اپنے جدِ عظیم

علی ابن ابی طالبؑ سے اپنے اتصال اور ارتباط کو بھی بیان کرتے ہیں۔(۱) کافی کی کتاب "الحجت" کے ابواب نیز بحارالانوار کی جلد ۷ میں اس قسم کی احادیث جن میں صراحتاً یا کنایتاً امامت کے دعوے اور اس کی جانب دعوت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے' بکثرت دیکھی جاسکتی ہیں۔

ایک اور قطعی ثبوت' وہ شواہد ہیں جو اسلامی مملکت میں امامؑ کے وسیع تبلیغی نیٹ ورک کا ذکر کرتے ہیں اور اس نیٹ ورک کی موجودگی کو مسلّم الثبوت قرار دیتے ہیں۔ یہ شواہد اس قدر زیادہ اور مدلل ہیں کہ اگر ایک بھی صریح حدیث موجود نہ ہوتی تب بھی اس موضوع کی حتمیت پر کوئی شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ایک مضبوط تبلیغی نیٹ ورک کا وجود

ائمہؑ کے غیر مدوّن زندگی نامے کا مطالعہ کرنے والا شخص اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ کیا ائمہؑ شیعہ کے پاس بنی امیہ کے آخری دور میں مملکت اسلامی کے گوشہ و کنار میں داعی اور مبلغ نہیں تھے جو ان کی امامت کی تبلیغ کرتے اور لوگوں سے ان کی اطاعت اور حمایت کا عہد لیتے؟

پس اس صورت میں اس تنظیمی وابستگی کی علامات کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے جو ائمہؑ اور ان کے شیعوں کے درمیان مالی و فکری تعلق کے حوالے سے واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں؟

یہ دنیا کے گوشہ و کنار سے مدینے میں لائے جانے والے شرعی اموال' یہ مسائل دینی کے بارے میں اس قدر زیادہ تعداد میں کیے جانے والے سوالات' یہ ہر طرف پھیلی ہوئی تشیع کی جانب دی جانے والی دعوت' اور اسی طرح مملکت اسلامی کے اہم ترین حصوں میں اولادِ علیؑ سے پائی جانے والی اس قدر محبت' اور امامؑ کے گرد خراسان' سیستان' کوفہ' بصرہ' یمن اور مصر سے تعلق رکھنے والے محدثین اور راویانِ حدیث کا انبوہ کثیر؟۔۔۔ کونسی طاقت تھی جو ان سب چیزوں کو وجود میں لے آئی تھی؟ کیا ان متناسب اور ایک دوسرے سے مربوط مظاہر کو کسی حادثے یا خود بخود پیدا ہوجانے والے واقعات کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے؟

۱۔ اصول کافی۔ج ۱۔ص ۱۸۶

ان تمام مخالفانہ پروپیگنڈوں کے باوجود جو بلا استثنا ہر مقام پر خلافتِ اموی کی پروپیگنڈہ مشینری کی جانب سے جاری تھا' حتیٰ کہ منبروں پر اور خطبوں میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا نام مذموم ترین شخصیت کے طور پر لیا جاتا تھا' کیا بغیر کسی مضبوط تبلیغاتی نیٹ ورک کی موجودگی کے ممکن تھا کہ اولادِ علیؑ کو دور دراز علاقوں میں اس قدر محبوبیت اور جاذبیت حاصل ہوتی کہ کچھ لوگ محض ان کے دیدار' ان سے استفادے اور ان سے دوستی اور تعلق کے بندھن کا اظہار کرنے کے لیے طویل مسافت طے کر کے حجاز اور مدینہ آتے اور دینی علم کو جو شیعہ عقیدے کے مطابق سیاست اور حکومت کی طرح سے ہے' ان سے حاصل کرتے اور متعدد مواقع پر بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے عسکری اقدام (اور روایات کی زبان میں قیام اور خروج) کی ان سے خواہش کر بیٹھتے؟ اگر شیعوں کے پاس ہتھیار صرف ائمہؑ کے علم و زہد کو ثابت کرنا تھا' تو پھر ان سے مسلح قیام کی درخواست کے کیا معنی کیے جاسکتے ہیں؟

اصحاب ائمہؑ کا تقیہ کا پابند ہونا

ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ اگر واقعی ایسے وسیع اور کارآمد تبلیغاتی چینل کا کوئی وجود تھا تو تاریخ میں اس کا کوئی نام ونشان کیوں نہیں ملتا اور صراحتاً اس حوالے سے کوئی واقعہ کیوں نقل نہیں ہوا ہے؟

اس کا جواب (جیسا کہ اس سے پہلے بھی اشارہ کیا گیا) بطور خلاصہ یہ ہے کہ اس نشان نہ ملنے کی پہلی وجہ کو تو اصحاب امامؑ کی ایک معتبر اور مترقی اصول "تقیہ" کی سخت پابندی میں تلاش کرنا چاہیے' جو کسی بھی اجنبی شخص کے امامؑ کی تنظیموں کے اندر داخل ہونے میں رکاوٹ بنتی تھی۔ اس کے بعد اس مرحلے میں' شیعوں کے جہاد کے ناکام رہنے اور حکومت حاصل نہ کر سکنے میں تلاش کرنی چاہیے' کہ یہ (حکومت حاصل نہ کر پانا) خود چند عوامل کا نتیجہ ہے۔۔۔۔

اگر بنو عباس بھی حکومت حاصل نہ کر پاتے تو بے شک ان کی خفیہ جدوجہد اور فعالیت اور تبلیغاتی سرگرمیوں کے دوران پیش آنے والے تلخ وشیریں واقعات سینوں میں رہ جاتے اور کسی

کو ان کی کوئی خبر نہ ہوتی اور تاریخ میں بھی درج نہ ہوتے۔

ائمہ اہل بیتؑ کی امامت کے لیے وسیع تبلیغات

ان سب کے باوجود ایسی روایات کی بھی کوئی کمی نہیں ہے' جن میں اہل بیتؑ کی امامت کے لیے وسیع شیعی تبلیغات کا ذکر تقریباً صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ اس باب میں ہم صرف ایک حدیث کے ذکر پر اکتفا کریں گے جو کہتی ہے کہ: کوفہ سے تعلق رکھنے والا ایک شخص خراسان گیا اور اس نے لوگوں کو جعفر ابن محمدؑ کی "ولایت" کی طرف دعوت دی۔ کچھ لوگوں نے اس کی دعوت کا مثبت جواب دیا اور اطاعت کی جبکہ ایک گروہ نے سرپیچی کی اور منکر ہو گیا' جبکہ ایک اور گروہ نے احتیاط کی اور اپنی رائے محفوظ رکھی۔ یہاں تک کہ احتیاط کرنے والے ان افراد میں سے ایک شخص کا گزر مدینہ سے ہوتا ہے اور وہ امامؑ سے ملاقات کرتا ہے تو آنحضرتؑ اعتراض آمیز لہجے میں فرماتے ہیں:

تم جو پرہیزگار اور احتیاط کرنے والے شخص تھے' تم نے فلاں مقام پر فلاں ہوس بازی پر مبنی خیانت آمیز عمل انجام دینے میں احتیاط کیوں نہیں کی؟!۔۔۔(۱)

جیسا کہ ہم نے دیکھا' تبلیغ کرنے والے کا تعلق کوفہ سے اور تبلیغ کا علاقہ خراسان ہے' نام مخفیہ اور اس کی دعوت امام جعفر صادقؑ کی ولایت (حکومت) کی جانب ہے اور احتیاط کرنے والے کی دعوت اطاعت اور فرمانبرداری کی جانب ہے۔

کلامی و ادبی مناظرے

امامت کی جانب دعوت و تبلیغ کے لیے ائمہؑ اور شیعوں کے نقطۂ نظر کو روشن کرنے کے لیے ایک قابل لحاظ ثبوت وہ مباحث اور مناظرات ہیں جو ان کے اور ان کے سیاسی رقیب (بنوامیہ اور بنوعباس) کے درمیان جاری رہتے تھے۔ یہ مباحث' جو کلامی اور مذہبی استدلال کی صورت میں

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۴۷۔ ص ۷۲

بھی ہوتے تھے اور زیادہ بلیغ زبان (شعری زبان) میں بھی ہوا کرتے تھے واضح طور پر ثابت کر دیتے ہیں کہ امامت کے بارے میں شیعی تبلیغات کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ائمہ اہل بیتؑ کے لیے حکومت کا حق ثابت کیا جائے۔ پس اہل بیتؑ کی جانب ان کی دعوت کا نمایاں ترین پہلو اس حق کی بازیابی کے لیے جدوجہد اور نااہل افراد کے ہاتھوں سے سیاسی طاقت کو لے لینا شمار کیا جاتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام کے دور امامت کو بنو عباس کی تحریک اور ان کی حکومت حاصل کرنے کے ساتھ معاصر ہونے کی بنا پر اس قسم کے مباحث کے لیے حساس ترین دور قرار دیا جاسکتا ہے اور شیعہ شعرا اور اسی طرح بنی عباس کے شعرا کے اشعار کو امامؑ کے نقطۂ نظر کا عکاس شمار کیا جاسکتا ہے۔

عباسی شعرا اپنے بے بنیاد اور تحکم آمیز استدلال کی بنیاد پر بنو عباس کو اس منصب کا حقیقی مالک متعارف کرواتے تھے اور اس کے مقابل ہم علوی دھڑے کے شعرا اور مداحوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ایک مغلوب اور ناراض گروہ کی سی زبان اور لہجے میں غالب حکام (یعنی بنو عباس) کی ان کے جرائم اور حق سے روگردانی کی بنا پر مذمت کرتے ہیں اور حق کو اولادِ علیؑ سے متعلق اور انہیں اس کا لائق اور حقیقی مالک قرار دیتے ہیں۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں "مذہبی شعر" کے بلند مقام کو دیکھتے ہوئے اور اس نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ایک مسلک کا معتقد شاعر اپنے مسلک کی ترویج اور اس مسلک کے اہداف اور نعروں کی وضاحت کے سلسلے میں مؤثر ترین کردار ادا کرتا تھا' قدرتی بات نظر آتی ہے کہ مختلف سیاسی گروہوں سے وابستہ شعرا کے کلام اور ان کے اشعار کو خصوصی اہمیت حاصل ہو۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں ادبیات کا کردار

کتاب "العباسیون الاوائل" کے مصنف نے درست طور پر پہلی اور دوسری صدی ہجری میں (جو عربی شاعری اور خطابت کی ترقی کا زمانہ تھا) ادبیات کے حساس اور انتہائی اہم کردار کو اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"۔۔۔ادبیات دلوں پر اثر انداز ہوتی تھیں اور لوگوں کی محبت اور ان کے رجحانات کو اِس گروہ یا اُس گروہ کی جانب متوجہ کرتی تھی۔ اس زمانے میں شعرا اور خطبا (آج کے) اخبارات کی مانند ہوتے تھے' جن میں سے ہر ایک کسی خاص سیاسی سمت کا اظہار اور اس کا دفاع کرتا تھا اور موثر زبان اور بلیغ انداز میں اپنے سیاسی رجحان کی حقانیت پر دلائل لاتا اور اپنے رقیبوں کے دلائل کو مسترد کرتا تھا۔" (۱)

مثال کے طور پر بنو عباس کا طرف دار شاعر' یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ خلافت اس گھرانے کا حق ہے' انہیں پیغمبر سے متصل کرتا تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ پیغمبرؐ کی میراث اس خاندان کی طبیعی ملکیت ہے اور یہ استدلال کرتا تھا کہ چچاؤں کی موجودگی میں میراث نواسوں کو نہیں ملا کرتی' پس حکومت پیغمبرؐ کی میراث' ان کے چچا عباس کے لیے ہے اور ان کے بعد عباس کے بیٹوں کا حق ہے۔

اَنّٰی یَکُوْنُ وَلَیْسَ ذَاكَ بِکَائِنٍ
لِبَنِی الْبَنَاتِ وِرَاثَةُ الْاَعْمَامِ

کیسے ممکن ہے؟ اور یہ کسی صورت نہیں ہو سکتا کہ نواسے چچاؤں کی میراث کے مالک بن جائیں۔ یا اس طرح سے کہ چچا کی موجودگی میں چچازاد بھائیوں کی نوبت نہیں آتی۔

فَاَبْنَاءُ عَبَّاسٍ هُمْ یَرِثُوْنَهٗ کَفُّ الْعَمِّ
لِابْنِ الْعَمِّ فِی الْاِرْثِ قَدْ یَحْجُبُ

فرزندانِ عباس ان کے برحق وارث ہیں جس طرح سے چچا' چچازاد تک وراثت کے پہنچنے میں مانع ہوتا ہے۔

دوسری طرف علویوں کی جانب رجحان رکھنے والے شعرا اپنے قصیدوں میں (جو اکثر احساسِ مظلومیت کی بنیاد پر جوشِ محبت سے لبریز ہوا کرتے تھے) ان استدلالوں کو رد کر کے دوسرے استدلال لاتے اور بسا اوقات اسی انداز کے استدلات کے ذریعے سے ائمۂ شیعہ کے

۱۔ العباسیون الاوائل۔ ڈاکٹر فاروق عمر۔ ص ۱۰۶

دعویٰ کی حقانیت کا اظہار کرتے۔ مثال کے طور پر سید حمیری کے ایک معروف قصیدہ میں واقعۂ غدیر کی جانب یہ اشارہ:

مَنْ كُنْتُ مَوْلَا فَهٰذَا لَهٗ
مَوْلٰى فَلَمْ يَرْضَوْا وَ لَمْ يَقْنَعُوْا

جس کا میں مولا ہوں پس یہ (علی) اس کے مولا ہیں اور مخالفین اس زمانے ہی سے راضی اور قانع نہیں ہوئے تھے۔

چچا کی میراث کے بارے میں عباسی شاعر کے استدلال کا جواب جعفر ابن عثمان طائی کے قصیدے میں:

بِنْتٌ نِصْفُ كَامِلٍ مِنْ مَالٍ
تَرِثُهٗ وَ الْعَمُّ مَتْرُوكٌ بِغَيْرِ سِهَامٍ

لڑکی میراث سے پورا آدھا حصہ حاصل کرتی ہے جبکہ چچا کا اس میراث میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

دعبل خزاعی کے قصیدے میں پیغمبرؐ کی وراثت کی جانب اشارہ:

اَضَرَّ بِهِمْ اِرْثُ النَّبِيِّ فَاَصْبَحُوا
يُسَاهِمُ فِيْهِمْ مَنِيَّةٌ وَ مَنُوْنٌ

پیغمبر کی میراث نے انہیں نقصان پہنچایا کیونکہ ہر طرف سے موت اور وحشت کا لقمہ بن گئے۔

ایسا شخص جو بنی عباس کی زندگی سے مربوط کتب اور دوسری صدی ہجری کی تاریخ کا معمولی سا بھی مطالعہ کرے اس کے لیے اس قسم کے مکالموں اور شعر کی زبان میں سیاسی مناظروں کے سینکڑوں نمونے حاصل کرنا کوئی دشوار کام نہیں۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ائمہؑ کے دور میں شیعی شعر و ادب میں نمایاں طور پر سیاسی اور کلامی بحث اور استدلال کیا جاتا تھا اور ہمارے دور کے فارسی قصیدوں میں رائج خیال بافیوں کا کوئی اثر ان اشعار میں نہیں تھا۔

حق حکومت ثابت کرنا

اس وقت اہم بات یہ نہیں ہے کہ ان استدلالی اشعار کا مضمون (جو دونوں طرف کے لوگ اپنی حقانیت کے دعووں پر قائم کیا کرتے تھے) کس حد تک مستحکم اور سند قرار دیئے جانے کے قابل ہے۔ اہم بات' اس چیز کی جانب توجہ ہے کہ یہ دو باہم متصادم گروہ' جو اس دور کے اسلامی معاشرے میں وسیع پیمانے پر سیاسی اور عقیدتی گروہ بندی کو ظاہر کرتے تھے' کیا کہتے تھے اور کیا دعویٰ کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنے لیے کس حق کا قائل تھا۔

جیسا کہ واضح طور پر نظر آتا ہے' ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ اپنے لیے ایک حق کو ثابت کریں اور دوسرے سے سلب کرلیں۔ یہ حق' وہی حقِ حکومت ہے۔ ان دونوں گروہوں کے اشعار میں پیغمبرؐ کی جس میراث کی جانب اشارہ ہوا ہے اور ان دونوں گروہوں کے شعرا اسے اپنے پسندیدہ گھرانے (علوی یا عباسی) کا حق قرار دیتے تھے' وہ مسلمانوں پر ولایت اور حکومت کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

بے شک تنازعہ اس بات پر نہیں تھا کہ ان دونوں قبیلوں' علوی اور عباسی' میں سے کون پیغمبرؐ کی معنوی میراث جیسے علم و دانش' زہد و تقویٰ اور دوسری نمایاں خصوصیات کا مالک ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا حق نہیں ہے جس پر پائے جانے والے تنازعے کو وراثت میں اولویت کا مسئلہ حل کرے۔ کبھی بھی دو افراد یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان میں سے کسی نے کسی کے علم و دانش یا زہد و تقویٰ کو وراثت میں پایا ہے' اس سے اپنی قریبی رشتہ داری سے استدلال نہیں کرتے۔ اس قسم کا استدلال صرف اس جگہ پیش کیا جاتا ہے جب کسی شے یا ایک حق کے بارے میں نزاع ہو۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا امام جعفر صادقؑ کے زمانے کے شعرا جیسے (سید حمیری' جعفر بن عثمان و کمیت) اپنے اشعار میں مسئلۂ امامت کو پیش کرکے اور دوسرے شعرا کا جواب دے کر' جو اسی مسئلہ میں عباسیوں کا دفاع کیا کرتے تھے' بخوبی ظاہر کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ اور شیعہ (یعنی آنحضرتؐ سے وابستہ عناصر) سیاسی قوت کی بازیابی اور اسے ہاتھ میں لینے کی خاطر اور اپنے

نالائق رقیبوں کو میدانِ سیاست سے نکالنے کے لیے ہمہ پہلو اور وسیع تبلیغات میں مصروف تھے۔ علوی شعرا (جیسے کمیت' دعبل' فرزدق) اور دوسرے بڑے بڑے شعرا کے بلیغ اور انتہائی ہنرمندانہ اشعار میں اس بارے میں بہت سے شواہد تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ جن باتوں کا ذکر کیا گیا' وہ ان تمام چیزوں کا واضح نمونہ ہو سکتی ہیں۔

منصور کے نام محمد بن عبداللہ حسینی کا خط

اس حصے کو ختم کرنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے استدلال کی ایک دوسری قسم بھی پیش کروں جو شعر کے علاوہ کسی اور انداز سے پیش کیا گیا ہے اور جو اس دور کے باہم متصادم ان گروہوں کے درمیان دعوے کی وسعت کی علامت ہے۔

ہمارے پیشِ نظر مثال محمد بن عبداللہ حسینی (جو "صاحب نفسِ زکیہ" کے نام سے معروف ہیں) کا منصور عباسی کے نام ایک خط ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ محمدؑ علوی گھرانے کی ایک معروف ترین شخصیت تھے جنہوں نے عباسی حکومت کے خلاف اس کے ابتدائی دور میں ایک مسلح تحریک کی قیادت کی۔ اس زمانے کے معمول کے مطابق عسکری ٹکراؤ کے مرحلے میں بھی طرفین کے احتجاج آمیز مکتوب ان کے اہداف اور مقاصد کی پیش رفت میں اہم کردار ادا کیا کرتے تھے۔ یہ خطوط' جو انتہائی سرعت کے ساتھ معاشرے کے عام افراد میں بھی پھیل جاتے اور سب ان کے مضامین سے باخبر ہو جاتے تھے' عوام الناس کے کسی ایک گروہ کی جانب متوجہ ہونے اور اس کی حمایت کرنے اور اس گروہ سے وابستہ لوگوں کے حوصلے بلند کرنے میں اثر انداز ہوتے تھے اور اسی وجہ سے عام طور پر طرفین کی جانب سے عوام کے لیے پسندیدہ ترین اور قابلِ قبول ترین استدلالوں پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔

جو مکتوبات محمد نے منصور عباسی کے نام تحریر کیے ہیں' ان میں سے ایک میں واضح طور پر اس بات کا اثبات کیا جاتا ہے کہ خاندانِ علوی حکومت کے سوا کسی اور چیز کا دعویدار نہیں ہے اور اسے اپنا حق سمجھتا ہے اور لوگوں کو اپنی امامت کی جانب دعوت دے کر درحقیقت انہیں حکمرانوں

کے ساتھ جنگ کی دعوت دیتا ہے۔ اس زیر بحث مکتوب کی عبارت یوں ہے۔

"وَإِنَّ أَبَانَا عَلِيًّا كَانَ الْوَصِيُّ وَ كَانَ الْإِمَامُ. فَكَيْفَ وَرِثْتُمْ وِلَايَتَهُ وَ وَلَدُهُ حَيَاةٌ" (۱)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مکتوب میں یہ استدلال جو عباس کے رائج استدلال کی رد میں لایا گیا ہے۔ وہ لوگ خلافت اور امامت کو ایسی میراث سمجھتے تھے جو عباس کے توسط سے پیغمبر خداؐ سے ان تک پہنچی ہے اور اسی ناقابل قبول استدلال کے ذریعے عوام الناس کے ذہنوں کو ان لوگوں کی حکومت کو قبول کرنے پر تیار کرتے تھے جن کے پاس رسول خداؐ کی رشتہ داری کے سوا کوئی اور امتیاز نہ تھا۔ محمد اپنے اس واضح اور منطقی بیان کے ذریعے اپنے رقیبوں کے لیے استدلال کا راستہ بند کر دیتے ہیں۔ اس بیان میں اولاً امام کی تعبیر اور اس کا استعمال کیا جانے والا مفہوم اور ثانیاً محمد (جو بہر حال علوی گھرانے کا ایک نمایاں عنصر تھے) کے محرک کا بخوبی مشاہدہ ہوتا ہے۔

۲۔ اَحکامِ دین کی تبلیغ شیعی فقہ کے اسلوب سے اور تفسیر قرآن شیعہ طرزِ فکر کے لحاظ سے وسیع ترین علمی اور فقہی مدرسہ

یہ بھی امام صادقؑ کی زندگی کی ایک واضح روش تھی، جو کچھ دوسرے ائمہؑ کی حیات میں دیکھ سکتے ہیں اس سے زیادہ ممتاز زیادہ صریح اور زیادہ صحیح شکل میں۔ یہاں تک کہ فقہ شیعہ "فقہ جعفری" کے نام سے موسوم ہوئی اور یہاں تک کہ جن لوگوں نے امام کی سیاسی سرگرمیوں کو نظر انداز کیا ہے وہ بھی اس بات پر متفق ہیں کہ امام صادقؑ اپنے زمانے میں وسیع ترین (یا وسیع ترین مدارس میں سے ایک) علمی و فقہی مدرسے کے مالک تھے۔ انھی میں سے ایک چیز جو امامؑ کی

۱۔ واضح ہے کہ ہمارے جد حضرت علیؑ، پیغمبرؐ کے وصی اور مسلمانوں کے امام تھے۔ اب جبکہ ان کے فرزند زندہ ہیں، کس طرح تم نے حکومت کو اپنی میراث بنالیا ہے۔ (تاریخ طبری۔ ج ۶۔ ص ۱۹۵ نقل از جہاد الشیعہ۔ ص ۴۳)

زندگی پر تحقیق کرنے والے زیادہ تر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہی ہے' وہ اس عمل کا سیاسی اور مزاحمتی مفہوم ہے اور اب ہم اسے بیان کریں گے۔

خلیفہ: لوگوں کے سیاسی اور دینی امور کا ذمے دار

مقدمے کے طور پر یہ بات جاننا ضروری ہے کہ اسلام میں خلافت' اس لحاظ سے حکومت کے دوسرے مناصب سے مختلف ہے کہ یہ فقط ایک سیاسی ادارہ نہیں بلکہ ایک سیاسی اور مذہبی قیادت ہے۔ حاکم اسلامی کے لیے "خلیفہ" کا نام ولقب اسی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ایک سیاسی قائد سے بڑھ کر ہے' وہ پیغمبر کا جانشین ہے اور پیغمبر ایک دین کو لانے والے اور معلم اخلاق ہیں البتہ اس کے ساتھ ہی وہ حاکم اور سیاسی رہبر بھی ہیں۔ پس اسلام میں خلیفہ سیاست کے علاوہ لوگوں کے دینی امور کا ذمے دار اور ان کا مذہبی پیشوا بھی ہوتا ہے۔

حکومتی مشینری کے دینی شعور کا ذوق

یہ مسلّم حقیقت اس بات کا موجب بنی کہ خلافتِ اسلامی کے اوّلین سلسلے کے بعد' ان کے بعد آنے والے حکمرانوں نے' جو بہت کم دینی شعور کے مالک اور بسا اوقات اس سے بالکل ہی محروم تھے' یہ طے کیا کہ اس کمی کو خود سے وابستہ دینی شخصیات کے ذریعے پورا کریں اور اپنی حکومت کے نمک خوار فقہا' مفسرین اور محدثین سے الحاق کے ذریعے خلافت کو دوبارہ دین و سیاست کا ایک مرکب بنائیں۔

حکومتی مشینری میں شریعت سے واقف عناصر کی موجودگی سے ایک دوسرا فائدہ یہ تھا کہ وہ ظالم اور آمر حکمران کی خواہش اور حکم کے مطابق آسانی کے ساتھ مصلحتوں کے تقاضے کے مطابق احکامِ دین میں تغیر وتبدل کر دیتے اور استنباط اور اجتہاد کے پردے میں (جسے عام لوگ تشخیص نہیں دے سکتے تھے) حکمِ خدا کو اپنے آقاؤں کی خاطر بدل ڈالتے تھے۔

گزشتہ صدیوں کے کتاب نویسوں اور مورخوں نے احادیث گھڑنے اور تفسیر بالرائے کی

وحشت ناک مثالیں' جن میں اکثر سیاسی طاقتوں کا ہاتھ نمایاں ہوا کرتا تھا' ذکر کی ہیں جس کے ایک گوشہ کی جانب ہم آئندہ صفحات میں مناسبت کے ساتھ اشارہ کریں گے۔ یہ عمل جو اوّلین زمانے میں (پہلی صدی ہجری کے آخر تک) زیادہ تر حدیث اور روایت کی شکل میں ہوتا تھا' اس نے رفتہ رفتہ فتویٰ کی شکل بھی اختیار کر لی تھی۔ لہٰذا بنو امیہ کے آخری اور بنو عباس کے ابتدائی دور میں بکثرت ایسے فقہا تھے جو قیاس اور استحسان جیسے بدعت آمیز اسالیب سے استفادہ کرتے ہوئے' احکام اسلامی کو اپنے نقطۂ نظر (جو درحقیقت اکثر مقتدر حاکم کا نقطۂ نظر ہوا کرتا تھا) کے مطابق صادر کیا کرتے تھے۔

ہو بہو یہی عمل تفسیر قرآن کے بارے میں بھی انجام دیا جاتا تھا۔ مفسر کی رائے اور نقطۂ نظر کے مطابق تفسیر قرآن کرنا' ان کاموں میں سے تھا جو لوگوں کی نظر میں حکم خدا کو با آسانی دگرگوں اور انہیں جس چیز کا مفسر خواہش مند ہوا کرتا تھا (وہ بھی اکثر اس بات کو چاہتا تھا جو حاکم کی خواہش ہوا کرتی تھی) معتقد بنا سکتا تھا۔

فقہ' احادیث اور تفسیر میں دو گروہ

اسلام کے قدیم ترین ادوار ہی سے فقہ' حدیث اور تفسیر دو نمایاں گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے: ایک گروہ غاصب حکومتوں سے وابستہ تھا جو بہت سارے مقامات پر حقائق کو ان حکومتوں کی مصلحت پر قربان کر دیا کرتا تھا اور انتہائی کم قیمت پر حکم خدا میں تحریف کر دیتا تھا۔ اور دوسرا گروہ اصیل اور امین تھا جو کسی مصلحت کو احکام الٰہی کی درست تشریح پر مقدم نہیں رکھتا تھا اور یوں [یہ گروہ] لامحالہ ہر قدم پر حکومت اور اس کے زرخرید فقہا کے سامنے آ جاتا تھا اور اسی وجہ سے اکثر اوقات غیر قانونی اور غیر رسمی شکل میں رہتا تھا۔

امام صادقؑ کا علمی ٹکراؤ

یہ جان لینے کے بعد ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ امام صادقؑ کے زمانے میں حکومتی فقہا کے

مقابل فقہ جعفری فقط ایک سادہ دینی عقیدہ کا اختلاف نہیں تھی بلکہ وہ بیک وقت اپنے ساتھ دو مخالفانہ باتوں کی بھی حامل تھی: پہلی اور اہم ترین بات حکومت کا دینی شعور سے بے بہرہ ہونا اور لوگوں کے فکری امور کو حل کرنے میں اس کی ناتوانی کا اثبات (یعنی درحقیقت منصب خلافت کے لیے ان کی عدم صلاحیت کو ثابت کرنا) تھا۔ اور دوسری بات رسمی فقہ میں کی جانے والی تحریفات کو سامنے لانا تھی جس کی وجہ فقہی احکام کے بیان میں فقہا کی مصلحت اندیشی اور حکمرانوں کی خواہش اور ان کے حکم کو پیش نظر رکھنا تھی۔ امام صادقؑ علمی بساط پھیلا کر اور حکومت سے وابستہ علما سے ہٹ کر' اسلامی فقہ و معارف کے بیان اور تفسیرِ قرآن کے ذریعے عملاً اس حکومت کے خلاف مقابلہ کے لیے کھڑے تھے۔ امام صادقؑ اس ذریعے سے ان تمام مذہبی مشینری اور سرکاری فقہا' جو خلفا کی حکومت کا ایک اہم ترین شعبہ شمار ہوتے تھے' کا راستہ روکتے اور حکومت کو اس کے مذہبی پہلو میں تہی دست بنا دیتے تھے۔

منصور کی جانب سے دھمکیاں اور دباؤ

اس بات کا ہمارے پاس کوئی واضح اور قطعی ثبوت موجود نہیں کہ بنو امیہ کی حکومت کس حد تک امام صادقؑ کی معارضانہ سرگرمیوں کی جانب متوجہ تھی۔ لیکن گمانِ قوی یہ ہے کہ بنو عباس اور بالخصوص منصور کے دور میں' جو کہ بہت ہوشیار اور ذہین آدمی تھا اور جس نے خلافت سے پہلے کی ساری زندگی امویوں کے خلاف جنگ کی فضا میں بسر کی تھی' اور اسی وجہ سے وہ علویوں کے جہاد اور ان کے مجاہدین کے حوالے سے گہرے نکات سے بھی واقف تھا' دربار عباسی کے سرداروں کو اس بالواسطہ جہاد کے مؤثر کردار کی جانب متوجہ ہونا چاہیے تھا۔

امامؑ کی فقہی اور تعلیمی سرگرمیوں کے حوالے سے منصور کی لامحدود دھمکیاں' دباؤ اور سخت گیری جس کا ذکر بہت سی تاریخی روایات میں آیا ہے' اس کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہی توجہ اور احساس تھا۔ نیز حجاز اور عراق کے معروف فقہا کو دارالحکومت میں جمع کر لینے پر اس کا بہت زیادہ زور (کہ اس کا ذکر بھی کئی تاریخی روایات میں موجود ہے) اس کے اسی احساسِ ضرورت کی بنیاد پر تھا۔

خلفا کا دینی علوم سے بے بہرہ ہونا

اپنے اصحاب اور نزدیکی افراد کے ساتھ امامؑ کے مکالمات اور تعلیمات میں "خلفا کے علم و دانش سے بے بہرہ ہونے" کے معاملے کو اس بات پر دلیل بنانا کہ اسلام کی نظر میں انہیں حقِ حکومت حاصل نہیں' واضح طور پر نظر آتا ہے۔ یعنی یہ کہ امامؑ اسی مزاحمتی مضمون کو جوان کے فقہ اور قرآن کے درس کی صورت میں موجود تھا' صراحت کے ساتھ پیش بھی کرتے تھے۔

امامؑ سے ایک حدیث میں یوں نقل ہوا ہے کہ:

"نَحْنُ قَوْمٌ فَرَضَ اللهُ طَاعَتَنَا وَ أَنْتُمْ تَأْتَمُّونَ بِمَنْ لَا يُعْذَرُ النَّاسُ بِجَهَالَتِهِ"

ہم وہ ہیں جن کی فرمانبرداری کو خدا نے فرض کیا ہے جبکہ تم ایسے شخص کی پیروی کرتے ہو جس کی جہالت کی وجہ سے لوگ خدا کے نزدیک کوئی عذر نہیں پیش کر سکتے۔"(۱)

یعنی لوگ جو اپنے جاہل رہنماؤں اور نااہل حکمرانوں کی وجہ سے انحراف کا شکار ہو چکے ہیں اور خدا کی راہ کے علاوہ کسی اور راہ پر چل پڑے ہیں' یہ لوگ بارگاہِ الٰہی میں اس عذر کا سہارا نہیں لے سکیں گے کہ ہم نے اپنی تشخیص میں کوئی خطا نہیں کی ہے۔ یہ ہمارے پیشوا اور رہبر تھے جنہوں نے ہمیں اپنی جہالت کی وجہ سے اس راستے پر لگا لیا تھا۔ کیونکہ ایسے رہنماؤں کی اطاعت خود ایک غلط کام ہے۔ پس اس کے ذریعے بعد میں کیے جانے والے غلط کاموں کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔(۲)

۱۔ اصول کافی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۸۶

۲۔ قرآنِ کریم نے بھی اسی مضمون کو متعدد مقامات پر مختلف انداز سے دہرایا ہے۔ اس نے گمراہی کی راہ پر گامزن تابع اور متبوع افراد کے جھگڑے کی طرف اشارہ کیا ہے اور پیروکاروں کا یہ شکوہ بیان کیا ہے کہ ہمیں ان قائدین نے گمراہ کیا ہے۔۔۔۔۔ اور بالآخر اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس قسم کا عذر کسی سے بھی قبول نہیں کیا جائے گا اور دونوں گمراہ گروہوں کے لیے یکساں انجام متوقع ہے۔ رجوع کیجیے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۷' سورۂ شعراء کی آیت ۹۱ تا ۱۰۲' سورۂ سبا کی آیت ۳۱ تا ۳۳' سورۂ نساء کی آیت ۹۷

امامت: فکری اور سیاسی رہبری

امام صادقؑ سے پہلے اور ان کے بعد آنے والے اماموں کی تعلیمات میں بھی یہ مفہوم آشکارا طور پر موجود ہے کہ اسلام کے انقلابی معاشرے میں سیاسی رہبری وہی انقلابی رہبری ہوتی ہے اور لازماً فکری اور نظریاتی (ideological) رہبری کے ہمراہ ہوتی ہے۔ امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ ایک روایت میں اپنے جد امام محمد باقر علیہ السلام کے قول سے 'سلسلۂ امامت میں "سلاح" کو بنی اسرائیل کی گزشتہ اقوام میں "تابوت" کی مانند بتاتے ہیں۔

"ہمارے درمیان "سلاح" بنی اسرائیل کے تابوت ہی کی طرح سے ہے کہ وہ جس کسی کے پاس ہوتا' نبوت (اور دوسری روایت کے مطابق حکومت) اسی کی ہوتی۔ ہمارے درمیان بھی جس کے پاس سلاح ہو' رہبری اور قیادت اس کے لیے ہے۔" (اس تعبیر کی علامتی صورت اور اس کے انتہائی گہرے مفہوم کی جانب توجہ رہے)۔

اس موقع پر راوی پوچھتا ہے: "فَيَكُونُ السِّلَاحُ مُزَايِلاً لِلْعِلْمِ" یعنی کیا یہ ممکن کہ یہ سلاح کسی ایسے شخص کے پاس ہو جس کے پاس دینی نظریات کا علم نہ ہو(۱)

اور جواب میں امامؑ فرماتے ہیں: نہیں۔(۲)

یعنی معاشرے کی حکمرانی اور امتِ اسلامیہ کی انقلابی قیادت اس شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو سلاح اور دانش دونوں کا حامل ہو۔

پس امامؑ ایک طرف تو امامت کی شرط علمِ دین اور قرآنِ مجید کا صحیح فہم قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف وسیع علمی بساط بچھا کر اور دینی علوم کے طلبگاروں کی ایک کثیر تعداد کو اپنے گرد اکٹھا کر کے اور ایک مخصوص طرز پر دینی تعلیم دے کر (جو فقہ' حدیث اور تفسیر کی عام ڈگر سے مختلف تھی اور

۱۔ لفظ "مُزَایلاً" کے یہ معنی مشہور حدیث شناس' علامہ مجلسی کی کتاب مرآۃ العقول میں ان کے قول سے لیا گیا ہے۔

۲۔ کافی۔ ج۱۔ ص ۲۳۸' البصائر۔ ج ۴۔ ص ۴۴

مجموعی طور پر مرکز خلافت سے وابستہ علماً محدثین اور مفسرین کی دین شناسی سے کلی طور پر مختلف تھی) عملاً اپنی دین شناسی اور مرکز خلافت کی دین ناشناسی کو (اس سے وابستہ تمام نامی گرامی علما کے ساتھ) ثابت کرتے ہیں۔ اور اس طرح سے مسلسل جاری عمیق اور نرم تعرض کے ذریعے اپنے مبارزے کو ایک تازہ پہلو عطا کرتے ہیں۔

امام صادقؑ کے لیے منصور کی پابندیاں

جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا' بنوعباس کے ابتدائی حکمران جوخود اپنے اقتدار سے پہلے برسہا برس علوی مبارزات کے ماحول میں اور آل علیؑ کے اصحاب اور پیروکاروں کے ساتھ رہے تھے اور ان کے بہت سے اسرار و رموز اور پیچ وخم سے آگاہ تھے' وہ اپنے اموی اسلاف کے مقابلے میں ان دروس و ابحاث اور حدیث و تفسیر کے معترضانہ کردار سے زیادہ اچھی طرح واقف تھے۔

گویا اسی بنا پر منصور عباسی نے امام صادقؑ کے ساتھ اپنے رذالت آمیز تنازعات کے دوران' مدتوں امامؑ کو لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور لوگوں کو دینی تعلیم دینے اور لوگوں کو امامؑ کی خدمت میں آمدورفت رکھنے اور ان سے سوال کرنے سے منع کیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ مفضل بن عمر (معروف شیعہ اور ایک درخشاں شخصیت) نے نقل کیا ہے کہ اگر کسی کو عائلی مسائل اور طلاق اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کے بارے میں کوئی مسئلہ پیش آتا تو وہ آسانی کے ساتھ آنحضرتؑ کا جواب حاصل نہیں کرسکتا تھا۔(۱)

۳۔ سیاسی اور نظریاتی خفیہ تنظیموں کا وجود

ائمہؑ کے فرمان کے تحت خفیہ تنظیمیں

ہم نے کچھ دیر قبل اس بات کی جانب اشارہ کیا تھا کہ امام صادقؑ بنوامیہ کے آخری دور میں ایک ایسے نیٹ ورک کی رہبری کیا کرتے تھے جس کا کام اولادِ علیؑ کی امامت کی تبلیغ اور مسئلۂ

۱۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۳۔ ص ۲۳۸

امامت کی درست تشریح اور وضاحت تھا۔ ایک ایسا نیٹ ورک جو مملکتِ اسلامیہ کے دور دراز علاقوں سے لے کر خصوصیت کے ساتھ عرب عراق اور خراسان کے نواح تک میں مسئلۂ امامت کے بارے میں نمایاں اور نتیجہ خیز سرگرمیوں میں مصروف تھا' لیکن یہ مسئلے کا فقط ایک رُخ اور اس کا ایک معمولی حصہ ہے۔ امام جعفر صادقؑ اور دوسرے ائمہ کی سیاسی زندگی میں خفیہ تنظیموں کا موضوع' آپ حضراتؑ کی ہنگامہ خیز زندگیوں کا اہم ترین' ولولہ انگیز ترین اور ساتھ ہی ساتھ مجہول اور مبہم ترین حصہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے کہا' ایسی تنظیموں کا وجود ثابت کرنے کے لیے واضح مدارک (Sources) کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ کسی ایک امامؑ یا ائمہؑ کے نزدیکی ساتھیوں میں سے کسی نے شیعی فکری اور سیاسی تنظیموں کے وجود کا صراحتاً اعتراف کیا ہو۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا اعتراف کیا جائے۔ معقول توقع یہ ہے کہ اگر کسی دن آپ کا دشمن بھی امامؑ کی خفیہ تنظیم کا کھوج لگا لے اور خود امامؑ یا ان کے ساتھیوں میں سے کسی سے اس بارے میں کوئی بات پوچھے تو وہ کلی طور پر ایسی کسی بات کا انکار کریں اور اس کے گمان کو سوءِ ظن یا تہمت قرار دیں' خفیہ سرگرمی کی ہمیشہ یہی خاصیت ہوا کرتی ہے۔ البتہ ائمہؑ کی زندگی پر تحقیق کرنے والے سے بھی یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے وہ کسی ثبوت اور قابلِ اطمینان دلیل کے بغیر ایسی تنظیموں کا وجود قبول کرلے۔

لہٰذا ایسے قرائن وشواہد کو دیکھنا اور بظاہر سادہ انداز میں واقع ہونے والے حوادث کے باطن میں جھانکنا ہوگا' جو اگرچہ معمولاً انسان کی توجہ حاصل نہیں کر پاتے لیکن ان پر غور وخوض کرنے سے بہت سے پوشیدہ معاملات کی خبر مل جاتی ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر کے ساتھ ائمہؑ کی پوری ڈھائی سو سالہ زندگی پر نظر ڈالی جائے تو ائمہؑ کی خدمت میں اور آپؑ کے فرمان کے تابع ایک خفیہ تنظیم کا وجود تقریباً مسلّم ہے۔

خفیہ تنظیموں سے کیا مراد ہے؟

تنظیموں سے کیا مراد ہے؟ بدیہی ہے کہ اس سے مراد عصرِ حاضر کے مفہوم میں ایک منظم

جماعت (یعنی علاقائی اور شہری سطح پر منظم افراد اور قیادت کا ایک مجموعہ) نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے بلکہ تنظیم سے مراد لوگوں کا ایک ایسا گروہ ہے جو ایک مشترکہ مقصد کے لیے ایک مرکز' ایک دھڑکتے ہوئے دل اور ایک حکم دینے والے دماغ کے لیے مختلف فرائض انجام دیتا ہے اور اپنے درمیان روابط اور قربت و رشتے داری کے احساسات کا مالک ہے۔

یہ گروہ حضرت علیؑ کے زمانے (یعنی سقیفہ اور آپؑ کی خلافت کے درمیان کے پچیس سال میں) میں وہ خاص اصحاب تھے جو بظاہر حق کی حمایت میں نظر آنے والے اور عوام پسند کاموں کے برخلاف اس بات کے معتقد تھے کہ حکومت' مسلمانوں میں برترین اور فداکارترین فرد (علی ابن ابی طالبؑ) کا حق ہے۔

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت علیؑ کی جانشینی کے بارے میں پیغمبرؐ کے اعلانِ عام کو فراموش نہیں کیا تھا اور سقیفہ کے دن ہی سے خلافت کا میدان جیت جانے والے حضرات کے نقطۂ نظر کی مخالفت اور امامؑ سے وفاداری کا واضح اعلان کیا تھا' بعد میں اس سب کے باوجود عظیم مصلحت کی بنا پر' جس نے امامؑ کو سکوت بلکہ اوّلین خلفا کے ساتھ تعاون پر تیار کیا' ان لوگوں نے اسلامی معاشرے میں ایک عام فرد کی طرح زندگی بسر کی۔ لیکن اس کے باوجود کسی صورت اپنی صائب رائے' درست نقطۂ نظر اور صحیح تشخیص کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور ہمیشہ حضرت علیؑ کے پیروکار رہے اور یہی وجہ تھی جو درست طور پر انہیں "شیعیانِ علیؑ" کا نام دیا گیا اور وہ اس فکری اور عملی نہج کے حوالے سے مشہور ہوئے۔ سلمانؓ' ابوذرؓ' ابی بن کعبؓ' مقدادؓ' عمارؓ اور حذیفہؓ ۔۔۔ وغیرہ جیسی معروف و قابلِ افتخار شخصیات ان میں شامل ہیں۔

مصلحت آمیز اور حکمت پر مبنی روش

تاریخی شواہد اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ یہ گروہ' شیعی طرزِ فکر یعنی ایک فکری رہنما اور سیاسی قائد کی حیثیت سے امامؑ کی اطاعت کے لازم ہونے کے اعتقاد کی ہمیشہ مصلحت اور حکمت آمیز انداز سے لوگوں کے درمیان تبلیغ کیا کرتا تھا اور اس طرح رفتہ رفتہ اپنے گروہ کی تعداد میں

اضافہ کرتا تھا۔ یہ ایک ایسا عمل تھا جو علوی حکومت کے قیام کے لیے ایک مقدمۂ واجب شمار ہوتا تھا۔

۳۵ ہجری میں امیر المومنین حضرت علیؑ کے منصب حکومت سنبھالنے کے بعد وہ واحد گروہ جو شیعہ معیارات پر حکومت اور امامت پر یقین رکھتا تھا اور ان معیارات کی بنیاد پر امامؑ کو راسخ الایمانی کے ساتھ قبول کرتا تھا' وہ یہی شیعہ تھے' یعنی وہ گروہ جو تقریباً پچیس سال کے دور میں بالواسطہ یا بلاواسطہ امامؑ کا تربیت یافتہ تھا۔ دوسرے لوگ (یعنی اکثر افراد) اگرچہ امامؑ کی قیادت و رہبری کے دائرے میں زندگی بسر کرتے تھے اور عملاً شیعہ فکر کی سمت گامزن تھے لیکن ایسی فکری اور روحانی وابستگی جو انہیں شیعی تنظیموں کے اندر لے آئے' اس کے حامل نہ تھے۔

امامؑ کے طرفداروں میں ان دو طرح کے افراد کو مدِ نظر رکھا جائے تو امامؑ کے ساتھ اس دور کے عمارؓ' مالک اشترؓ' حجر بن عدیؓ' سہل بن حنیفؓ' اور قیس بن سعدؓ جیسے مسلمانوں اور ابو موسیٰ اشعری' زیاد بن ابیہ' سعد بن وقاص جیسے مسلمانوں کے درمیان مختلف طرزِ عمل کی توجیہ و تفسیر ہو سکتی ہے۔

ہمیں یہ بات قبول کرنی چاہیے کہ اگر واقعی شیعی تنظیمیں ایجاد کرنے کے سلسلے میں اولین اقدام اسی ملاقات (جس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا گیا ہے) میں اٹھایا گیا ہے تو اس کے لیے منصوبہ سازی اور میدان کی ہمواری مدتوں پہلے امام علی ابن ابی طالبؑ کے اپنے اصحاب اور نزدیکی ساتھیوں کے سامنے خطاب میں پیش بینی اور پیش گوئی کی جا رہی تھی۔

صلح قبول کرنے کے لیے امام حسنؑ کی حکمت عملی

امام حسنؑ کی صلح کے واقعے کے بعد ایک انتہائی اہم قدم جو اٹھایا گیا' وہ شیعی فکر کا پھیلاؤ اور اس باہم پیوستہ اجتماع کو منظم کرنا تھا جو اس وقت اموی سلطان کے ظالمانہ تسلط اور ظلم و ستم کے اثر سے جو اس پر روا رکھا جاتا تھا' ایک تحرک اور ڈائنامزم (dynamism) کا حامل ہو سکتا تھا۔ اور ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے کہ دباؤ اور گھٹن بجائے یہ کہ زیرِ دباؤ آنے والے کسی منظم گروہ کی توڑ پھوڑ کا عامل بنے' وہ اس کے اور زیادہ پیوستہ ہونے' راسخ تر ہونے اور مزید پھیلنے کا موجب ہو جاتا ہے۔

خالص اور قابلِ اعتماد شیعی طاقت کی جمع آوری' اموی حکمرانوں کی طرف سے شیعہ مخالف

سازشوں اور اقدامات سے ان کی حفاظت' ایک محدود لیکن گہرے دائرے میں خالص اسلامی فکر کی ترویج' صلاحیت (potential) رکھنے والی قوتوں کو جذب کرنا اور شیعہ اجتماع میں ان کا اضافہ کرنا' ایک مناسب موقع کا انتظار اور آخرکار بروقت قیام اور اقدام جو بنی امیہ کے جاہلی نظام کو درہم برہم کردے اور اسلامی اور علوی نظام کو اس کا جاگزیں کردے' یہ تھی امام حسنؑ کی حکمتِ عملی' اور وہ آخری وجہ جس نے آپؑ کے لیے صلح قبول کرنے کو ناگزیر بنا دیا تھا۔

شیعی تنظیمات کی بنیاد کا پہلا پتھر

گویا اسی وجہ سے تھا کہ واقعۂ صلح کے بعد جب شیعوں کا ایک گروہ مسیب بن نجبہ اور سلیمان بن صرد خزاعی کی سرکردگی میں مدینہ میں (جہاں امامؑ حال ہی میں کوفہ سے پلٹ کر آئے تھے اور آپؑ نے اس شہر کو دوبارہ اپنا فکری اور سیاسی مرکز بنایا تھا) آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عسکری قوت کی ازسرِنو تیاری' کوفہ پر تصرف اور شام کی فوجوں پر حملے کی تجویز پیش کی تو امامؑ نے اس گروہ میں سے دو افراد کا انتخاب کر کے انہیں اپنے پاس تنہائی میں بلایا اور ان بیانات کے ذریعے جن کی حکمت وکیفیت کے بارے میں کسی طریقے سے بھی کوئی درست معلومات موجود نہیں' انہیں اس منصوبے کے غلط ہونے کا یقین دلایا۔ اور یہ لوگ جب اپنے ساتھیوں اور ہمسفر افراد کے پاس واپس پلٹے تو مختصر اور سربستہ الفاظ میں انہیں یہ بات سمجھائی کہ مسلح قیام کا معاملہ کالعدم ہے اور ہمیں کوفہ واپس چلے جانا اور اپنے کاموں میں مشغول ہو جانا چاہیے۔

ان قرائن کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہی ہوشیار معاصر عرب مورخ' طٰہٰ حسین اس بات کا معتقد ہے کہ شیعوں کی تنظیم سازی کی تاسیس کا پہلا پتھر اسی روز اسی مجلس میں رکھ دیا گیا تھا جس میں دو معروف شیعہ شخصیات نے امام حسنؑ سے ملاقات اور مذاکرات کیے تھے۔

تنظیم سازی کا فرمان

''مجھ سے محروم ہو جانے کے بعد تم بہت سی ایسی چیزیں دیکھو گے جن کو دیکھنے کے بعد

موت کی تمنا کرو گے۔ بے انصافی، دشمنی، استبداد اللہ کے حق کو سبک سمجھنا اور جان کا خوف
۔۔۔جب ایسا ہو جائے تو اپنی حفاظت ایک الٰہی پیوند کے ذریعے اکٹھا ہو جانے سے کرو
اور انتشار کا شکار نہ ہو۔ مزاحمت، نماز (خدا کی یاد) اور تقیہ (کاموں کو خفیہ رکھنا) کو اپنی
عادت بنالو اور جان لو کہ خداوند عالم اپنے بندوں کو ہر لمحے ایک نئے رنگ میں ڈھل جانے
کو ناپسند کرتا ہے۔ حق اور اہلِ حق کو فراموش نہ کرو کیونکہ ہر ایسا شخص جو ہماری جگہ کسی اور کا
انتخاب کرے دنیا سے محروم ہو جائے گا اور اس دنیا سے گناہ گار اٹھے گا۔" (۱)

یہ کلام جو اموی دور اقتدار کے اہم ترین دگرگوں حالات کی واضح تصویر کشی اور منظم اور ہم آہنگ رہنے کے حکم پر مشتمل ہے، حزب شیعہ کی تشکیل کے حوالے سے ایک خوبصورت ترین دستاویزی ثبوت ہے اور یہ وہی منصوبہ ہے جو امام حسنؑ اور دو نمایاں ترین شیعوں کے درمیان ملاقات کے دوران عملی طور پر طے پایا تھا۔

بے شک تمام پیروکار اور شیعہ اس انتہائی دانشمندانہ منصوبہ سے مطلع نہ تھے۔ آپؑ پر ان کے دوستوں کی جانب سے اعتراض اور تنقید کی وجہ بھی یہی ہے لیکن اس مضمون پر مشتمل مسلسل دیئے جانے والے جوابات "کیا معلوم، شاید یہ تمہارے لیے ایک آزمائش اور تمہارے دشمن کے لیے زوال کا سبب ہو۔۔۔" (۲) جو آنحضرتؑ سے لیے جاتے تھے وہ اسی سیاست اور تدبیر کی جانب خفیہ اشارہ تھے۔

شیعی فکر کی نشوونما اور شیعوں کی تعداد میں اضافہ

معاویہ کے بیس سالہ دورِ خلافت میں اس دردانگیز بیان کی رو سے جو مورخین نے علویوں کے خلاف پورے ملک میں کی جانے والی تبلیغات کی کیفیت کے بارے میں تحریر کیا ہے، یہاں

۱۔ تحف العقول۔ ص ۸۲

۲۔ یہ صورتحال آج کے دور میں ان معاشروں سے ایک حد تک اور بعض پہلوؤں میں قابلِ موازنہ اور لائقِ تشبیہ ہے جو افراد کی قیادت اور رہبری کے تحت منظم کیے جاتے ہیں۔

تک کہ امیر المومنینؑ پر لعن و نفرین ایک رائج سنت اور رسم میں تبدیل ہو چکی تھی اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی جانب سے کسی نمایاں سرگرمی کے ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے صرف یہی باہمی پیوستگی اور تنظیم تھی جس نے پورے حجاز اور عراق میں شیعی فکر کی نشو و نما اور شیعوں کی تعداد میں اضافے کا امکان پیدا کیا۔

امام حسنؑ کی صلح کے بعد بیس سال

صلح کے واقعے کے بیس سال بعد اگر ہم اس علاقے کے فکری میدان پر نظر ڈالیں تو کوفہ میں شیعہ شخصیات نامور ترین، معروف ترین اور معزز افراد ہیں۔ مکہ اور مدینہ اور بعض دور دراز علاقوں میں بھی شیعہ زنجیر کے حلقوں کی طرح ایک دوسرے سے متصل اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہیں۔ جب چند سال بعد ایک نمایاں شیعہ شخصیت (حجر بن عدیؓ) کو قتل کیا گیا تو ملک کے کئی مقامات پر باوجود یہ کہ شدید دباؤ اور گھٹن کا ماحول تھا اعتراض آمیز آوازیں بلند کی گئیں اور خراسان میں ایک معروف شخصیت غیظ و غضب میں اعتراض کے بعد شدت غم سے وفات پا گئی۔(۱)

معاویہ کی موت کے بعد ہزار ہا افراد نے امام حسینؑ کے نام خط لکھے اور حضرتؑ کو قیام کے لیے کوفہ آنے کی دعوت دی۔ امامؑ کی شہادت کے بعد دسیوں ہزار لوگ امامؑ کا انتقام لینے والے گروہوں سے متصل ہو گئے اور واقعہ "توابین" یا مختار اور ابراہیم بن مالک اشتر کے لشکر میں شامل ہو کر اموی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

تاریخِ اسلام پر نظر ڈالنے والا انسان اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ کیا شیعی تفکر کا رواج اور اس کی جانب اس حد تک رجحان ایک متحد، یک دل، یک جان اور یک جہت شیعوں کی منظم تنظیمی سرگرمیوں کے سوا یعنی ان ہی تنظیموں کی طرف سے جن کا اندازہ امام حسنؑ کی صلح کے فوراً بعد طٰہٰ حسین نے لگایا ہے، ممکن اور معقول نظر آتا ہے؟ بے شک اس کا جواب نفی میں ہے۔ اموی

۱۔ رجوع کیجئے صلح امام حسنؑ

حکمرانوں کا منظم پروپیگنڈہ' جو سینکڑوں قاضیوں' قاریوں' خطیبوں اور گورنروں کی طرف سے ترتیب دیا جارہا تھا' اس کا جواب ایک دوسرے منظم تبلیغاتی نظام کے علاوہ ممکن ہی نہیں ہے جو ایک متحد اور یکساں جہت رکھنے والے لیکن خفیہ گروہ کی جانب سے ترتیب دیا گیا ہو۔

منظم سرگرمیوں کا بڑھ جانا

معاویہ کی موت کے قریب یہ منظم سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں اور ان کی رفتار بہت تیز تھی یہاں تک کہ مدینے کا گورنر جسے امامؑ کی سرگرمیوں کی رپورٹ دی گئی تھی' معاویہ کو تحریر کرتا ہے کہ:

"عمر ابن عثمان (متعلقہ اہلکار) نے مجھے اطلاع دی ہے کہ عراق کے بعض افراد اور حجاز کی بعض معروف شخصیات کی حسینؑ کے یہاں آمد و رفت ہے اور گمان یہ ہے کہ وہ قیام کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس بارے میں چھان بین کی اور مجھے خبر ملی ہے کہ وہ (حسینؑ) بھی مخالفت کا پرچم بلند کرنے کے درپے ہیں۔ تم اپنی رائے تحریر کرو۔۔۔" (۱)

واقعۂ کربلا اور امامؑ کی شہادت کے بعد عراق میں شیعوں کی منظم سرگرمیاں مزید منظم اور زیادہ متحرک ہو چکی تھیں اور یہ اس بات کی تاثیر تھی جسے کوفہ کے شیعوں کے نفسیاتی حالات (جن میں بہت سارے لوگ حکومت کی طرف سے بے خبری میں ضرب کھا چکے تھے اور عاشور کے میدانِ کارزار میں نہیں پہنچ سکے تھے) نے ایجاد کیا تھا اور اس کا سخت افسوس اور درد اُسے جلا بخشتا تھا۔ اُس صدی کے معروف مؤرخ طبری تحریر کرتے ہیں کہ:

"یہ گروہ مسلسل اسلحہ جمع کرنے' جنگ کی تیاری کرنے اور لوگوں کو (خواہ وہ شیعہ ہوں یا غیر شیعہ) خونِ حسین کا انتقام لینے کی خفیہ دعوت دینے میں مسلسل مشغول تھا۔ پس ایک کے بعد دوسرا گروہ ان کی دعوت پر لبیک کہتا اور ان کے ساتھ آملتا تھا۔ یہ کام اسی طرح جاری تھا کہ یزید ابن معاویہ مر گیا۔" (۲)

۱۔ ثورۃ الحسین۔ ص ۱۱۸ منقول از اعیان الشیعہ اور الاخبار الطوال

۲۔ تاریخ طبری۔ ج ۷۔ ص ۴۶ نقل از جہاد الشیعہ (مولفہ خانم سمیرۃ مختار اللیثی)۔ ص ۲۸

"جہادالشیعہ" کی مؤلفہ بالکل صحیح اظہار نظر کرتی ہیں کہ: "شیعہ گروہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ایک منظم گروہ کے طور پر ظاہر ہوا تھا جسے سیاسی رشتہ اور مذہبی عقائد یکجہتی دیتے تھے اور ان کے جنگجو جوان اور سردار اجلاس بھی کرتے تھے اور توابین کا گروہ اس قسم کے گروہوں کے وجود کا اوّلین مظہر تھا۔(۱)

شیعوں کی پیش قدمی

جیسا کہ تاریخی حوادث اور ان مؤرخین کی رائے سے سمجھ میں آتا ہے' معاویہ کے زمانے کے حوادث اور اسی طرح امام حسینؑ کی شہادت کے بعد وقوع پذیر ہونے والے واقعات صرف شیعوں کی پیش قدمی اور منصوبہ بندی اور قیادت سے تعلق رکھتے تھے۔ ورنہ عام افراد میں بہت سے لوگ تھے جو انسانی محرکات یا اموی حکومت سے ناراضگی یا دوسری وجوہات اور محرکات کی بنا پر عملاً شیعوں کے ہم قدم تھے اور ان کے ہمراہ میدانِ کارزار یا ان اقدامات میں جو شیعی رنگ کے حامل تھے' شرکت کیا کرتے تھے۔ لہٰذا ہمیں یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تمام لوگ جو تاریخ کے اس حصے میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں شریک تھے اور وہ فعال یا عام کردار کے مالک ہوا کرتے تھے' ان کا شمار شیعوں میں (یعنی ائمہؑ کی منظم تنظیموں میں) ہوتا تھا۔

اعلیٰ حکومتی شخصیات میں خوف وہراس پیدا کرنا

ایک نکتہ جس کی جانب مندرجہ بالا وضاحت کی روشنی میں ہم تاکید کرنا چاہتے ہیں' وہ یہ ہے کہ زیر بحث زمانے تک یعنی امام حسینؑ کی شہادت کے بعد' امیر المومنینؑ کے دور کی طرح شیعہ کا نام اور اصطلاح کا اطلاق فقط انہی لوگوں پر ہوتا تھا جو فکر و عمل کے لحاظ سے سچے اور امامؑ کے ساتھ مستحکم اور مشخص رابطہ رکھتے تھے۔ یہی گروہ تھا جو امام حسنؑ کی صلح کے بعد آپؑ کے فرمان پر منظم اور باہم مربوط شیعی تنظیموں کو وجود میں لایا اور یہی لوگ تھے جنہوں نے اپنی وسیع و عریض اور گہری

۱۔ نقل از جہادالشیعہ۔ص ۲۸

تبلیغات کے ذریعے لوگوں کو اپنی تنظیمی حدود میں شامل کیا اور ایسے بہت سے لوگ جو فکر اور نظریہ (ideology) کے لحاظ سے ان کے ہم قدم اور ان کی مانند نہیں تھے انہیں شیعہ مہمات میں شامل کیا۔ بے شک وہ روایت جسے ہم نے اس گفتار کے آغاز میں نقل کیا (جو عاشورا کے حادثے کے بعد مومنین کی تعداد کو تین یا پانچ افراد تک محدود کرتی ہے) اس میں اسی قسم کے افراد کو مدنظر رکھا گیا ہے یعنی ائمہؑ کے مستحکم اور پرعزم شیعہ اور پیروکار جو انقلاب علوی و ہاشمی کی تحریک اور تکامل کی طرف کے سفر میں آگاہانہ اور معین کردار کے مالک تھے۔

امام سجادؑ کی خفیہ اور بظاہر آہستہ جدوجہد کے نتیجے میں اس جمعیت نے اپنے باصلاحیت عناصر کو بازیاب کیا' اپنے اندر جذب کیا اور ان میں اضافہ کیا۔ اور جیسا کہ امام صادقؑ نے اس روایت میں' جس کی جانب ہم نے ابھی اشارہ کیا' بیان فرمایا کہ لوگ متصل ہوئے' تعداد میں اضافہ ہوا اور ہم دیکھتے ہیں کہ امام سجادؑ امام باقرؑ اور امام صادق علیہم السلام کے دور میں مسلسل یہی جمعیت تھی جو اپنی مشکوک سرگرمیوں سے حکومت کی اعلیٰ شخصیات کو ہراس میں مبتلا کرتی اور بسا اوقات انہیں سخت ردعمل پر اکساتی تھی۔

شیعہ: حزبِ امامت کا ایک نام

مختصر یہ کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں اور ائمہؑ کے زمانے میں شیعی تہذیب نیز غیر شیعوں کے شعور و ادراک میں لفظ شیعہ کا اطلاق محض محبانِ اہلِ بیتؑ اور ان کی حقانیت اور دعوت پر یقین رکھنے والوں پر ہی نہیں ہوتا تھا (اگرچہ وہ اس حرکت اور فعالیت کے دائرے میں شریک نہ ہوتا ہو' جن کا مرکز و محور امامؑ ہوا کرتے تھے) بلکہ شیعہ ہونے کے لیے اس کے علاوہ ایک اور بنیادی و حتمی شرط بھی ہوتی تھی اور وہ تھی امامؑ سے فکری اور عملی وابستگی اور ان سرگرمیوں میں شرکت جو امامؑ کی قیادت اور رہبری میں اپنے غصب شدہ حق کی بازیابی اور علوی و اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے مختلف فکری و سیاسی اور کبھی عسکری جدوجہد کی صورت میں پیش آتی ہوں۔ یہ وابستگی وہی چیز ہے جسے شیعی کلچر میں "ولایت" کا نام دیا گیا ہے۔

دراصل شیعہ نام تھا "حزبِ امامت" کا۔ وہ حزب جو امامؑ کی رہبری میں معین سرگرمیوں میں مصروف ہوتی تھی اور سخت دباؤ اور گھٹن زدہ ماحول میں اعتراض کرنے والی تمام احزاب اور تنظیموں کی طرح خفیہ طور پر اور تقیہ میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ یہ حیاتِ ائمہؑ بالخصوص امام صادقؑ کی زندگی کا دقیق نگاہ سے جائزے کا نچوڑ ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ ایسی چیز نہیں ہے جس کے اثبات کے لیے ہم صریح اور واضح دلائل کی توقع رکھیں۔ اس لیے کہ کسی خفیہ گھر کے دروازے پر کسی ایسی تختی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے جس پر تحریر ہو کہ "یہ ایک خفیہ گھر ہے"۔ اگرچہ حتمی نتائج تک پہنچانے والے قرائن کے بغیر اسکے وجود کو مسلّم بھی نہیں سمجھا جاسکتا۔ پس مناسب یہی ہے کہ ہم قرائن و شواہد اور اشاروں کی جستجو کے لیے خم ٹھونک کر کھڑے ہو جائیں۔

"باب"، "وکیل"، "صاحبِ سِرّ"

وہ انتہائی پُرمعنی تعبیرات جو ائمہؑ کی زندگی سے تعلق رکھنے والی روایات یا اوّلین صدیوں کے مؤلفین کے کلام میں ایک دقیق مطالعہ کرنے والے شخص کی نظر کو متوجہ کرتی ہیں، وہ "باب"، "وکیل" اور "صاحبِ سِرّ" کی تعبیرات ہیں۔ روایات کے علاوہ بڑے شیعہ محدثین نے بھی ائمہؑ کی حیات سے متعلق روایات کی تحقیق اور دقیق جائزے کے دوران ائمہؑ کے بعض اصحاب کو "صاحبِ سِرّ" یا "باب" یا "وکیل" کے طور پر متعارف کروایا ہے۔

ممتاز شیعہ محدث اور علمِ رجال کے ماہر ابن شہر آشوب بعض ائمہؑ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے کسی شخص کو اس امامؑ کے "باب" کے طور پر متعارف کراتے ہیں۔ مثلاً امام سجادؑ کے احوال میں "وَكَانَ بَابُهُ يَحْيَى بْنَ أُمِّ الطَّوِيلِ" اور امام باقر علیہ السلام کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے "وَكَانَ بَابُهُ جَابِرَ بْنَ يَزِيدَ الْجُعْفِيَّ" اور امام صادق علیہ السلام کی زندگی کے احوال میں "وكان بابه محمد بن سِنَانٍ"۔ رجال کشی میں زرارہ، برید، محمد بن مسلم، ابوبصیر کو "مُسْتَوْدَعُ سِرِّی" (میرے رازوں کے امانتدار) اور حدیث کی دوسری کتابوں میں امام

جعفر صادقؑ کے قول سے معلی بن خنیس کے لیے "وکیل" کی تعبیر نقل کی گئی ہے۔

ان تعبیروں میں سے جو بھی امامؑ سے نقل نہیں ہوئی اور جنہیں قدیم شیعہ مؤلفین نے بیان کیا ہے، بے شک وہ تعبیرات بھی ائمہؑ کی زندگی پر وسیع اور عمیق تحقیق کا ماحصل اور اس استنباط کا نتیجہ ہے جو اس راوی کی خصوصیات سے حاصل ہوا ہے۔ بہر حال ان پر معنی تعبیرات کا انتخاب ائمہؑ کی زندگی کی قابل توجہ اور اہم خصوصیات کا ترجمان ہے۔

"دروازہ" "کارگزار" اور "رازدار" یہ تین تعبیرات، معمولی سا بھی غور و فکر کرنے والے ہر شخص کے سامنے ایک خفیہ نظام نمایاں کر دیتی ہیں جو ائمہؑ کی ظاہری سرگرمیوں کے ماوراء یا انہی سرگرمیوں کے بطن میں موجود ہے۔ مناسب ہوگا کہ ہم ان تین تعبیرات پر کچھ غور و فکر کریں۔

ائمہؑ کی زندگی میں "راز" کیا ہیں؟

جب تک کسی کا کوئی راز نہ ہو اس وقت تک اسکا کوئی رازدار بھی نہیں ہوتا۔ ائمہؑ کی زندگی میں یہ راز کیا ہے؟

یہ کیا چیز ہے کہ ائمہؑ کے تمام معتقدین اور ساتھی اسے برداشت کرنے کی اہلیت یا طاقت نہیں رکھتے اور فقط انگلیوں پر شمار کیے جانے والے چند افراد کو ہی اسے برداشت کرنے کی لیاقت اور صلاحیت حاصل ہوئی تو انہیں "رازدار" کا شرف حاصل ہوا۔

دور حاضر کے عام شیعہ، جو ہر چیز کو دور سے دیکھا کرتے ہیں، ان کے مطابق، یہ راز "امامت" ہے۔

لیکن راز امامت ہے کیا؟

کیا غیبی یا ماورائے طبیعی اسرار ہیں؟

غیر معمولی کاموں اور معجزہ دکھانے کی قدرت اور صلاحیت کا ہونا اور غیب سے آگاہی ہے؟

میں، اس قسم کے بلند اور عظیم الشان انسانوں سے ایسی قدرت اور آگاہی کو علم و دانش کے

برخلاف قرار دیے بغیر اور اسلامی تصور کائنات میں انسان اور کائنات کے بارے میں جو پہچان حاصل ہوتی ہے اُسے اِس دعوے کے منافی سمجھے بغیر اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ "رازِ امام" کو ایسے ماورائے طبیعی مسائل میں منحصر کیا جائے۔

آخر امام اپنے اصحاب کو اس قسم کی چیزوں کو پوشیدہ رکھنے کی فضیلت پر اس قدر تلقین اور تاکید کیوں کرتے ہیں کہ شیعہ کتب حدیث میں "باب الکتمان" (۱) کے عنوان سے ایک باب وجود میں آجاتا ہے؟

یہ راز ایسی چیز کو ہونا چاہیے جس کے برملا ہونے کی صورت میں گروہ شیعہ اور خود امامؑ کو ایک بڑا خطرہ لاحق ہو جاتا ہو اور وہ چیز غیبی اور ماورائے طبیعی امور سے ہٹ کر کچھ اور ہو۔

کیا اس کا تعلق شیعی معارف سے ہے؟

کیا اسلام کی وہ تفسیر ہے جو شیعہ کرتے ہیں اور وہ خاص نقطۂ نظر ہے جو فقہ اور احکامِ شریعت کے بارے میں پیش کرتے ہیں؟

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اموی اور عباسی دور کے گھٹن زدہ ماحول میں ان معارف کا اظہار تدبیر اور مہارت کے ساتھ ہونا چاہیے' ہر کسی کے سامنے پیش نہیں کرنا چاہیے اور نااہلوں کو ان سے دور رکھنا چاہیے' لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہیں امامؑ کے راز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ معارف پوری طرح سے "اختصاصی" ہونے کے باوجود مسلمان مملکت کے کئی بڑے شہروں میں موجود حدیث اور فقہ کے سینکڑوں حلقوں میں پیش کیے جاتے تھے اور اس زمانے کے شیعہ انہیں ایک دوسرے کے لیے نقل کرتے اور ان کی شرح و تفسیر کیا کرتے تھے اور ایک فریضے کی طرح ایک دوسرے کو ان کی تعلیم دینے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ بالفاظِ دیگر یہ معارف "اختصاصی" ضرور تھے' لیکن امام کا راز نہ تھے۔

اختصاصی ہونا یعنی یہ کہ ان کا رواج اور اہمیت صرف شیعہ گروہ میں محدود تھی اور غیر شیعہ افراد

۱۔ رجال کشی۔ ص ۳۸۰

فقط خاص حالات میں انہیں حاصل کر سکتے تھے لیکن ایسا نہ تھا کہ امامؑ کے دوستوں اور اصحاب کے صرف انگشت شمار افراد انہیں جانتے ہوں اور دوسرے نہ صرف یہ کہ مطلع نہ ہوں بلکہ ان کے پاس ان سے مطلع ہونے کا کوئی راستہ بھی نہ ہو اور خاص شیعوں کو بھی یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ انہیں بتا سکیں۔

تنظیموں کے نہ کھلنے والے راز

امامؑ کی تنظیموں کے اسرار سے متعلق مسائل اور نکات موجود ہیں۔ ایک ایسا گروہ جو ایک انقلابی ہدف اور ایک رہنما نظریہ (ideology) کے ہمراہ سیاسی اور فکری میدان میں قدم رکھتا ہے اس کے کچھ اسرار ہوتے ہیں۔ طے شدہ طریقۂ کار بڑے اقدامات کے لیے زمان و مکان اور اہم موثر مہروں کے نام و نشان اور ذمہ داریاں' موثر مالی ذرائع' کچھ اہم حوادث اور واقعات کی خبریں اور رپورٹیں اور ایسی ہی دوسری باتیں' ایسے تنظیمی راز ہیں جنہیں کھولا نہیں جاسکتا اور جو اہم کارپردازوں اور رہبر کی ذات کے علاوہ کسی اور کے جاننے کی باتیں نہیں ہیں۔ لیکن بسا اوقات مختصر یا طویل مدت میں یہ تمام باتیں فاش ہو جاتی ہیں لیکن ایک معین زمانے سے پہلے صرف مقررہ افراد' جو ان رازوں سے سروکار رکھتے ہیں' ان سے آگاہ ہو سکتے ہیں' اور یہی لوگ "رازدار" یا "رازوں کے امین" ہیں۔

دوستوں اور شیعوں کے سامنے ان رازوں کو بیان کرنا ان رازوں کے لیے دشمن کے راستے کو کھولنا ہے اور یہ ایک بہت بڑی غلطی اور نقصان کا سبب ہے۔ ایسی غلطی جس کا انجام بسا اوقات ایک گروہ کا خاتمہ ہوا کرتا ہے۔ ایسا شخص جو "امامؑ کے راز" کو فاش کرے' اس نے ایک دشمن کا کام کیا ہے۔ پس ہم بہت آسانی کے ساتھ امامؑ کے اس فرمان اور معنی کو سمجھ سکتے ہیں کہ:

"جو شخص ہم سے جنگ کے لیے کھڑا ہوتا ہے' وہ اس سے زیادہ گراں بار نہیں جو ہمارے راز فاش کرتا ہے۔"(۱)

۱۔ رجال کشی۔ ص ۳۸۰

"باب" امامؑ اور شیعوں کے درمیان رابطہ

امامؑ کے شیعوں کے ساتھ انتہائی خفیہ رابطوں میں بسا اوقات لازم ہوتا ہے کہ تنظیمی اسرار کا تبادلہ بالواسطہ طور پر اور "وسیلوں" کے ذریعے سے ہو۔ یہ مکمل طور پر ایک معقول تدبیر ہے۔

جس موقع پر اجنبی آنکھیں اور کان انتہائی حرص کے ساتھ امامؑ اور ان کے شیعوں کے درمیان تعلقات کو کشف کرنا چاہتے ہوں (حج کے ایام میں، مدینے کی زیارت میں، دور دراز شہروں سے قافلوں کی آمد و رفت وغیرہ میں۔۔۔) امامؑ اور شیعوں کے درمیان کسی بھی قسم کا رابطہ اگر خلیفہ کے جاسوسوں کے ذریعے فاش ہو جائے تو شیعہ تنظیموں کی گہرائی تک پہنچنے کا سرا مل سکتا ہے۔ ان مواقع پر خود امامؑ بھی کبھی نرمی سے اور کبھی عتاب کے ساتھ لوگوں کو اپنے آپ سے دور کیا کرتے تھے۔ سفیان ثوری سے فرماتے ہیں:

"تمہارے پیچھے حکومتی ادارے لگے ہوئے ہیں اور ہمارے اردگرد خلیفہ کے جاسوس ہیں۔ میں تمہیں مسترد نہیں کرتا لیکن تم ہمارے پاس سے چلے جاؤ۔"(۱)

ایسے شیعوں کے لیے جو سر راہ آپؑ سے ملے ہوں اور تقیہ کی وجہ سے ان سے منہ پھیر لیا ہو، ان کے لیے خدا سے طلب رحمت فرماتے ہیں اور جس نے کسی ایسے ہی موقع پر احترام کے ساتھ انہیں سلام کیا ہو اس کی مذمت فرماتے ہیں۔(۲)

ایسے مواقع پر امامؑ اور ایسے افراد (جو امامؑ کے اشارے اور فرمان یا ان کے راز اور اسے بیان کرنے کے محتاج ہوں) کے درمیان کسی واسطے کا ہونا لازم ہے۔ یہ واسطہ "باب" (دروازہ) ہے۔ اصولاً یہ "باب" باتجربہ اور نزدیک ترین ساتھی اور خبروں اور اطلاعات کے لحاظ سے سب سے زیادہ باخبر اور زیادہ مطلع ہونا چاہیے۔ اسے اس شہد کی مکھی کی طرح ہونا چاہیے کہ اگر موذی حشرات

۱۔ مناقب شہر آشوب۔ ج ۳۔ ص ۲۴۸

۲۔ کافی۔ ج ۲۔ ص ۲۱۹

یہ جان لیں کہ اس کے اندر کیا ہے تو وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور اس کا شہد چوس لے۔(۱) یہ اتفاق نہیں ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ "باب" اکثر مواقع پر سخت نگرانی اور انتقام کا نشانہ بنے ہیں۔

امام سجادؑ کے باب "یحییٰ ابن ام الطویل" کو اس ظالمانہ طریقے سے قتل کیا گیا۔(۲) امام محمد باقر علیہ السلام کے باب "جابر بن یزید جعفی" اپنے مصنوعی پاگل پن کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی دیوانگی کی وجہ سے چند روز قبل خلیفہ کی طرف سے حاکم کوفہ کو دیئے گئے اپنے قتل کے حکم سے نجات پاتے ہیں۔امام صادقؑ کے باب "محمد بن سنان" بھی اگر اس قسم کے خطرات کا سامنا نہ کر رہے ہوتے تو شاید امامؑ (جنہوں نے متعدد مواقع پر صراحت کے ساتھ ان سے رضامندی کا اظہار اور ان کی تعریف فرمائی تھی) انہیں بظاہر اپنی طرف سے مسترد نہ فرماتے۔ایک معروف اور جانے پہچانے راوی سے امامؑ کا اظہار بیزاری کرنا' جس کے بارے میں بارہا امامؑ کے نزدیکی اور خاص افراد نے امامؑ کی زبانی رضامندی کی باتیں سنی تھیں' غالب گمان کے مطابق سوائے ایک تنظیمی طریقہ کار کے کوئی اور وجہ نہیں ہو سکتی۔

"وکیل" کون ہے؟

"وکیل" کی بھی یہی صورتحال ہے۔امامؑ کے اختیار میں موجود اموال کا محافظ اور انکی براہ راست وصولی اور تقسیم کا ذمے دار شخص بے شک بہت سے رازوں سے آگاہ ہوگا جن میں سے کم ترین اور معمولی ترین راز' مال دینے اور وصول کرنے والے افراد کے نام ہیں۔اور یہ امامؑ کی تنظیمات کے دشمنوں کے لیے کوئی معمولی لقمہ نہیں۔مدینہ میں امام صادقؑ کے وکیل "معلی بن خنیس" کا عبرتناک انجام اور کوفہ میں امامؑ کے وکیل "مفضل بن عمر" کے بارے میں امامؑ کے تقیہ آمیز بیانات اس دعوے کی واضح اور آنکھیں کھول دینے والی مثالیں ہیں۔

۱۔یہ تعبیر حدیث سے لی گئی ہے

۲۔ابھی وہ زندہ ہی تھے کہ ان کا پیر کاٹ دیا گیا اور اس کے بعد انہیں قتل کر دیا گیا۔اس پرنور شخصیت سے واقفیت کے لیے رجال کشی اور رجال کی دوسری کتب کا مطالعہ فرمایئے۔

شیعوں کی تنظیمات کے کام کرنے کا انداز

یہ تین عنوان (باب، وکیل اور صاحب سر) جن میں سے ہر ایک کا مصداق شیعوں کی نمایاں ترین شخصیات میں دیکھا جاسکتا ہے، شیعوں کے حقیقی منصوبے پر پڑے پردوں کو ہٹاتے، امامؑ کے ساتھ ان کے تعلقات کے ابہامات کو دور کرتے اور مجموعی طور پر شیعوں کی تنظیمی جدوجہد کے انداز کو روشن کرتے ہیں۔

اس منصوبے کے مطابق شیعہ ہم آہنگ، قدم سے قدم ملا کر چلنے والے اور پرعزم افراد کا ایسا گروہ ہے جو ایک عظیم مرکز اور ایک مقدس اور الہام بخش محور کے گرد جمع ہو گیا ہے۔ وہ اسی سے سیکھتا ہے اور اسی کا حکم مانتا ہے۔ اسی کو خبریں اور درخواستیں پہنچاتا ہے۔ اس کی امید اسی سے وابستہ ہے اور اس کی آنکھیں اسی کے اشارۂ ابرو کی منتظر ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اپنے جذبات واحساسات کو بے تاب کر دینے والے اُبال کو بھی، جو کہ ایک ستم رسیدہ اور مقابلے کے لیے پرعزم گروہ کے لیے مظالم اور ناانصافیوں کی وجہ سے طبیعی معلوم ہوتا ہے، اسی کے حکیمانہ فرمان پر کنٹرول کر لیتا ہے۔ وہ خفیہ کاموں، مثلاً رازداری، کم گوئی، غیر معروف طور پر رہنا، اندرونی سطح پر باہمی تعاون، انقلابی انداز کی زہد و پارسائی وغیرہ کو بھی ایک مقدس اور الٰہی کام کے طور پر اسی سے سیکھتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

یہ کتاب

پیشوائے صادق علیہ السلام

ہم اپنی پیاری باجی

سیدہ شمیم زہرا نقوی

بنتِ سید نوازش علی نقوی مرحوم

کی بیسویں برسی کے موقع پر

محمدؐ و آلِ محمدؐ کی خدمت میں

بطور ہدیہ پیش کر رہے ہیں

پروردگارِ عالم محمدؐ و آلِ محمدؐ و شہدائے کربلا کے صدقے میں یہ ہدیہ قبول فرما اور انہیں اپنی رحمت کے سائے میں جوارِ معصومینؑ میں جگہ عطا فرما اوران کے ذمہ رہ جانے والے حقوق کو درگذر فرما اور ان کے درجات میں بلندی فرما۔ (آمین)

مومنین و مومنات سے ایک سورۂ فاتحہ کی استدعا ھے۔

سوگواران

سید جاوید رضا نقوی و برادران واہلِ خانہ